

مشکلات القرآن

مطالعہ قرآن

پیشویہ حضرت مولانا

مولانا عبدالحامید ریاضی

ہجرت ۱۳۸۰ھ
میں چھپایا گیا
پہلا دورہ

مشکلات القرآن

مُطالعة قرآن

بیسویں صدی میں

مولانا عبدالماجد دیابادی

محکم دلائل و براہین سے مزین
میاں جمیل پبلشرز، ۳۰-۱، پل روڈ، لاہور

DATA ENTERED

✓ ۲۹۷۶۱۰۷

ع ۵۱ م

۲۲۷۱۹

جُمْلہ حُقُوقِ مَحْفُوظ

پاراؤل: ۱۹۸۲ء

ناشر:

ذوالفقار احمد

یوسف اختر

مطبع:

امپرنٹ آفسٹ پرنٹرز

کتابتِ سرور

جمیل احمد قریشی تنویر قسم

قیمت:

تین روپے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

پیش نظر مجموعہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے ان قرآنی خطبات پر مشتمل ہے جو انھوں نے عبد اشکور میموریل کے سلسلہ میں مدراس کے معزز و مخیر تاجر جناب الحاج ٹی عبدالواحد صاحب سابق ایم پی کی فرمائش و خواہش پر قلم بند کئے تھے اور نیوکالج مدراس کے وسیع ہال میں ۲۸ جولائی سنہ ۱۹۷۷ء سے یکم اگست سنہ ۱۹۷۷ء تک پڑھ کر سنائے گئے تھے، ان جلسوں کی صدارت کی خدمت ان بطور کے راقم کے سپرد ہوئی تھی جس نے اس کو اپنی حیثیت سے واقف ہونے کے باوجود حاجی صاحب کے احترام، اور اپنی ایک بڑی سعادت سمجھ کر قبول کیا تھا، ان جلسوں میں مولانا کا نام سنکر نہ صرف شہر مدراس بلکہ بنگلور، میسور تک کے اہل ذوق علماء و فضلاء جدید دانش گاہوں کے اساتذہ و طلبہ اور مولانا کے عقیدت مند و نادیدہ مشتاق جمع ہو جاتے تھے شاید اس سے پہلے بہت عرصہ سے یہ وسیع ہال شائقین سے اس طرح نہ بھرا ہو گا جیسا کہ اس موقع پر وہ بھرا نظر آتا تھا، یہ سب خطبات نہایت ذوق و شوق اور سکون و خاموشی کے ساتھ سنئے گئے، راقم لفظ نے اپنی پہلی تقریر میں یہ کہا کہ عن قریب وہ زمانہ آنے والا ہے جب لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبد الماجد دریابادی کو دیکھا، اور ان کی زبان سے کچھ سنا تھا، کہنے والے کو بھی اس کا احساس نہ تھا کہ یہ زمانہ اتنی جلد آ جائیگا، یہ عقیدت مند قلم جو غلط لکھنے کا عادی تھا اسکو رحمۃ اللہ علیہ اور مرحوم و مغفور لکھنا پڑے گا، اس کا بھی قلع ہے کہ یہ کتاب بعض حوادث اور مجبوریوں کی بنا پر ان

مفید خدمت انجام دی جسکے بہت سے وہ لوگ شکار ہو گئے تھے جن کی ایک عمر ان عقلی
 علوم کے مطالعہ میں گزری تھی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے کتنے
 لوگوں کے ایمان بچ گئے، اور کتنے لوگوں کے ایمان میں نئی طاقت و توانائی پیدا ہو گئی۔
 اب یہ نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفہ یونان کے بجائے، تجربی علوم، سائنس،
 (بالخصوص) طبیعیات کا دور دورہ تھا، ہر شعبہ میں نئے نئے اکتشافات و تحقیقات ہو رہی تھیں،
 تاریخ و جغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت اختیار کر لی تھی، جو انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی،
 تمدن، علم المعیشت، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی وسعت اور مقبولیت حاصل
 کر لی تھی، بہت سے قدیم تاریخی مسلمات اور جغرافیائی ذرایع محل نظر، بلکہ خلاف واقعہ سمجھے
 جانے لگی تھیں، نئی کھدائیوں اور آثار قدیمہ کی دریافت نے نئی نئی حقیقتوں کی
 نقاب کشائی کی تھی، اس سب سے عالم اسلام بالخصوص اس کے علمی طبقہ پر ایک
 نئی ذمہ داری عاید ہوتی تھی، اب ان جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں اعجاز قرآن
 اور صداقت قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا، جیسا کہ قدیم علماء متکلمین
 اور مفسرین قرآن کو اپنے زمانہ میں یونانی فلسفہ اور حکمت اور اتحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا
 پڑا تھا، اور انھوں نے علمی و عقلی دلائل سے قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کیا تھا۔
 اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لیے کم سے کم ہمارے ملک میں مولانا عبدالمجید
 دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ نے کمر ہمت باندھی، اور انگریزی اور اردو میں اپنے تفسیری
 نوٹس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا، اس کام کی تکمیل کے لیے ہمارے علم میں وہ
 موزوں ترین آدمی تھے، اس لئے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، ان کو مطالعہ
 کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا،
 وہ جدید طبقہ کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے نیز زقار و زان
 دواں قافلہ سے وہ کبھی بچھڑنے نہیں پائے، اور اس تفسیری خدمت کے دوران

کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، اب یہ مقدمہ کی چند سطر میں اس وقت لکھی جا رہی ہیں، جب ان کی وفات پر پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا ہے۔

جس کتاب آسمانی کے متعلق "شہدات علینا بیانا" اور "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحاظ فطون" کی پیشین گوئیاں خود اسی کتاب میں موجود ہیں، اس کے لئے یہ انتظام خداوندی بالکل قرین قیاس اور قطعاً لائق تعجب نہیں ہیں کہ اس کے اعجاز و صداقت کو ثابت کرنے کے لئے ہر دور میں غیبی اور تقدیری انتظامات کئے جاتے رہیں، علوم و فنون، فکر انسانی کی ترقیاں، نئے نئے اکتشافات، معلومات جو نئے سوالات پیدا کرتے ہیں، اس کتاب ایمان رکھنے والے، اور اس سے عشق و محبت کرنے والے، اور اس کے لیے زندگیاں وقف کر دینے والے علماء ان سوالات کے جواب دینے کا بیڑا اٹھائیں، اپنے علم مطالعہ، تہذیب القرآن، جدید علوم سے واقفیت، اور اپنی محنت سے قرآن مجید کے اعجاز و صداقت کو بتھانے کریں، اس کے ابدی اصولوں اور بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان علم کی نارسائی، عقل کی کوتاہی اور فکر و نظر کی سطحیت سے جو مبہوم حجابات اور خیالی خلیج پڑ جاتی ہے اس کو دور کریں اور ہر زمانہ میں اس کو ایک "زندہ جاوید" کتاب ثابت کریں، جب ساری دنیا کو اس کے لفظی اعجاز، اور اسکی ماوراء، انسان بلاغت کی طرف توجہ تھی، اور اس کی صداقت کا یہی معیار سمجھا جاتا تھا، تو باقلانی، رمانی اور جر جانی نے "اعجاز القرآن" اور "دلائل الاعجاز" کے نام سے کتابیں لکھیں، اور خدا نے زنجیری، اور بیضادی جیسے نکتہ شناس اور بدور پیدا کئے، جب علوم عقلیہ اور فلسفہ یونان کے سحر و افسون سے سارا عالم اسلام مبہوم و مسحور نظر آنے لگا، تو خدا نے امام فخر الدین رازی جیسا مفسر پیدا کیا، جس نے ان عقلی و فلسفی اعتراضات کا جواب دیا جو ان علوم کے سطحی النظر مقلد، قرآن مجید کے غیبی حقائق اور ماوراء عقل علوم و مضامین پر وارد کرتے تھے، ان کی تفسیر نے جس کے ساتھ بہت سے ناقدین نے نا انصافی سے کام لیا ہے، اس مرعوبیت اور احساس کہتری کو دور کرنے میں بڑی

میں تو انھوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر و مطالعہ سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو یا الہا سال کی اس کوشش و مطالعہ اور عرق ریزی کا نتیجہ ان کی انگریزی اور اردو کی تفسیر ہے، اور یہ مضامین اس کے خاص انتخابات اور شریحات پر مشتمل ہیں جو انھوں نے مدرس میں اپنے خطبات کے موقع پر پیش کیے، امید ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ کرنے والوں اور اہل ذوق کے لئے معلومات افزا اور بصیرت افروز ثابت ہوں گے اللہ تعالیٰ اس کتاب کو بھی مولانا کی علمی خدمات اور دینی حسنات میں شامل فرمائے اور ناظرین کو زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔

ابوالحسن علی ندوی

فروری ۱۹۷۷ء



پیش لفظ

نَحْمَدُكَ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِكَ الْكَرِيمِ وَعَلَى آلِهِ وَآزْوَاجِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ

۱۱-۱۲ سال قبل جنوری ۱۹۵۵ء میں آپ کے اس شہر میں اول بار حاضری ہوئی تھی اور آپ حضرات کے اخلاص کی برکت سے ایک نئی چیز ”سیرت نبوی قرآن مجید سے“ وجود میں آگئی تھی، ابکی پھر آپ حضرات کے لطف و کرم نے کھینچا اور اگرچہ وہ خلاق مجسم ہستی آپ کے درمیان اب موجود نہیں جس کا نام فضل العلامہ ڈاکٹر عبدالحق کر نولی تھا، پھر بھی اس خادم سے انکار و اعراض نہ بن پڑا اور بصارت کی روز افزوں معذوری کے باوجود حاکم ہو جانا ہی پڑا۔

(اب کے موضوع ”مشکلات القرآن“ اور دوسرا عنوان اسی پہلے عنوان کی شرح و توضیح ”قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں“ اور مقصد یہ ہے کہ آج کے طالب علم کے ذہن میں قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران میں جہاں جہاں کچھ کھٹک پیدا ہوتی ہے اسے اپنے امکان بھر رفع کر دیا جاتا رہے اور اس کا ایمان اس پر بے غبار قائم رہے۔ یہ کوشش ایسے شخص کی طرف سے ہو رہی ہے جو علم سے بے بہرہ اور عمل سے بالکل ہی کور ہے۔ پھر بھی ایک عمر سے عادت قرآن سے لگے لیٹے پڑے رہنے کی ہو گئی ہے اور اسی لئے کچھ تھوڑی بہت کثرت کا تو قرآن کے نازل کرنے

والے کے فضل بکراں سے ہو ہی گئی ہے۔۔۔۔۔ جس کا یہ کلام ہے وہ اگر چاہے تو جاہل سے جاہل کے لئے بھی پتھر کو پانی بنادے۔

ظاہر ہے کہ ان معروضات میں کوئی شے بالکل نئی نہ مل سکے گی وہی چیزیں ملیں گی جنہیں اپنی اردو تفسیر قرآن کے پہلے ایڈیشن میں عرض کر چکا ہوں اور وہ اب زیر طبع دوسرے ایڈیشن میں مزید وضاحت کے ساتھ پیش ہو رہی ہیں، سامعین باتکن کے لطف و کرم سے توقع ہے کہ وہ اس تکرار کو بھی بے مزہ اور خالی از نفع نہ پائیں گے۔

(قرآن کی خدمت صدیوں سے ہوتی چلی آئی ہے اور بے شمار شرحیں اور تفسیریں اب تک لغوی اور نحوی، ادبی اور فلسفیانہ، فقہی اور کلامی، معنوی اور منطقی پہلوؤں سے لکھی جا چکی ہیں۔ اضافے کی ضرورت پھر بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گی) اللہ کے کلام کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کر لینا کس بندے کے بس کی بات ہے؟ امام فخر الدین رازی کی وفات ۶۰۶ھ ہجری میں ہوئی ہے اور ان کی کرامت کے لئے یہ کافی ہے کہ انہوں نے سارے متعلقہ علوم عصری کو قرآن کے خادم کی حیثیت سے اپنی تفسیر میں لاکھڑا کیا ہے۔

وہ سناؤں صدی ہجری کا آغاز تھا اور اب چودھویں صدی کا اختتام ہے حکمت الہی سے بعید کیا ہے کہ ان کے کسی کشف بردار کو مزید توفیق دے دے کہ انہیں کے دکھائے ہوئے راستے پر پڑانے علوم کو نئے سے بدل دے۔

بہر حال ایک خام کار سے جو کچھ بن پڑا آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اللہ انہیں حسن قبول عطا فرمائے اور اب آپ کی اجازت سے وہ معروضات پیش ہوتے ہیں۔

عبد الماجد

اگست ۱۹۷۷ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پہلا خطبہ

— ﴿۱﴾ —

سورۃ البقرہ جو تھے رکوع کے شروع میں آیت نمبر ۳ آتی ہے

(وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً
قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ
یَنْهٰکُمْ عَنْ نَّسَبِکُمْ وَتَقَدِّسُ لَکَ الْاَرْضُ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

اور وہ وقت بھی یاد کے قابل ہے جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے
کہا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں، وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو
بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا، حالانکہ ہم تیری حمد کی
تسبیح کرتے رہتے اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں، اشر نے فرمایا یقیناً میں
وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ظاہر ہے کہ جس وقت کا یہ مکالمہ ہے اشر کی جناب میں ایک نوری مخلوق فرشتہ کے
نام سے آباد تھی، اور یہ زمین بھی موجود تھی۔ اور اب اس میں ایک نئی مخلوق آباد ہونے جاری
تھی، جس کا کام زمین پر احکام قانونی و تشریعی کا نافذ کرنا ہو گا اور ذی شعور مخلوق کے درمیان
نظم و انتظام کرنا، ورنہ قانون تکوینی و طبی کے انصرام کے لئے تو فرشتے موجود ہی تھے اور یہ
کارخانہ حیات ان کے ذریعہ اور واسطہ سے بہر حال چل ہی رہا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ کسی بالکل

نئی صنف کی مخلوق کا وجود میں لانا مقصود تھا۔ اور جب ہی تو اس تخلیق کا ذکر قصداً اہتمام کے ساتھ فرمایا گیا۔ ورنہ صفت خلائی کے اظہار سے تو قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ اور ساری مخلوقوں کا ذکر سادہ فعل خلق کے ساتھ صیغہ ماضی (خلق) یا مضارع (یخلق) کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جنت اور عرش اور گرجی تک کی محض آفرینش یا وجود کا ذکر ہے، قصداً آفرینش کا نہیں۔ تو غرض کچھ اس اہتمام ذکر سے اور کچھ اپنی طبعی فراست اور دانائی سے فرشتوں نے بھانپ لیا، کہ اس خلیفہ الہی کی ترکیب کن غصروں سے ہوگی اور اس کی سرشت میں کیا کچھ رکھ دیا جائے گا۔ یہ سوچ سمجھ زبان سوال پر کھلی اند پور سے آداب عبودیت کے لحاظ کے ساتھ کھلی، کہ کیا حضور والا ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو زمین پر فساد اور باہم خوں ریزی کرتی رہے گی، ہاں حالیکہ ہم تو طاعت و حمد و سبج میں لگے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ پیرایہ بیان چونکہ استفہامی ہے اس لئے بخش اچھے اچھے مبصرین اور محققین اس بھول میں پڑ گئے کہ سوال بطور اعتراض ہے یعنی یہ آپ ایسی مخلوق کیسے وجود میں لارہے ہیں جو آپ ہی کے لئے تکلیف اور تکرار کا باعث ہوگی۔ اہل تفسیر میں سے اب نام کس کس کا لیا جائے، قدماء میں سے متعدد اہل نظر اسی طرف چلے گئے ہیں اور ایک اشکال اپنی تفسیر و تعبیر سے پیدا کر دیا ہے۔ حالانکہ ایسی نوری اور معصوم مخلوق سے کسی معصیت، اور پھر گستاخانہ معصیت کے صدور کا تو امکان ہی نہیں پیدا ہونا۔ ”باغی“ فرشتوں کا تخیل تمام تر سچیانہ ہے، نہ کہ اسلامی، بلکہ عجیب ہیں کہ عیسائیوں ہی کے رابطہ اور آمیزش سے یہ خیال مسلمان علماء میں سرایت کر آیا ہو۔

الْبَحْلُ کا ہمزہ کھلا ہوا استفہامی ہے لیکن چوتھی ہی صدی کے شروع کے لغوی ابو عبیدہ (د ۳۰۰ھ) نے اسے صاف کر دیا کہ :-

جاءت مع لفظ الاستفہام ولكن معناه الايجاب (اعجاز القرآن)

”ہمزہ کو لفظ استفہامی ہے لیکن معنایا کام ایجاب کا دیتا ہے۔“

اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کلام میں کوئی پہلو طنز یا اعتراض کا نہیں، بلکہ یہ نئی ہے تمام تر وفور عبودیت اور فرط نیاز مندی پر اور مراد ہے اس کے کہ آخر ہم غلامان بارگاہ کس دن، اور کس خدمت کے لئے ہیں؟ جو ارشاد ہونا ہے ہم ہی سے ہو، نہ کہ اس نئی مخلوق سے جو اپنی سرشت اور طبیعت کے لحاظ سے یقیناً کرائی طبع کا باعث ہوگی؟

مفسر جلیل حافظ ابن کثیر کے ہاں ہے:

ليس على وجه الاعتراض على الله وعلى وجه الحسد

لبني آدم كما يتوهمه بعض المفسرين

”اس میں نہ کوئی اعتراض ہے اللہ تعالیٰ پر اور نہ حسد ہے بنی آدم پر، حدیث کہ کسی کسی مفسر کو یہ ہم ہو گیا ہے۔“

اور اس سے ملتی ہوئی عبارت قاضی بیضاوی کی بھی ہے

وليس اعتراض على الله تعالى ولا طعن في بني آدم

على وجه الغيبة فانهم اعلى من ان يظن بهم ذلك۔

اور سب سے بڑھ کر تشفی بخش اس سلسلہ میں وہ تحریر ہے جو جائے شیخ وقت مفسر تھانوی نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں فرمائی ہے، ملاحظہ ہو:-

”مطلب یہ ہے کہ ہم سب کے سب آپ کے فرماں بردار ہیں، اور ان میں

کوئی مفسد و سفاک بھی ہوگا۔ اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لوگ

لگ اپٹ کر اس کو انجام دے لیں گے۔ یہ سب لوگ اس کام کے نہ ہوں گے

ان میں سے جو مطیع ہوں گے وہ تو جان و دل سے اس میں لگ جائیں گے،

مگر جو مفسد و ظالم ہوں گے ان سے کیا امید ہے کہ اس کام کو انجام دیں

خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن

میں کوئی کوئی کام کا اہل نہ ہوگا۔ اس خدمت کے لئے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے؟“

(ختم ہوئی مفسر تھانوی کی بات)

حکایت کا حکمانہ خاتمہ فرشتوں کے اس اعتراض پر ہوتا ہے کہ بیشک طرح طرح کی مخلوقات کی ضرورتوں کا، اور پھر ہر ایک کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا پورا علم بھی تو پھر ہی کو ہو سکتا ہے۔ ہمارے تھوڑے سے اور محدود علم کو نسبت ہی تیرے غیر محدود اور بے پایاں علم سے کیا ہو سکتی ہے۔ حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرپور بے شک تیرا ہی ہر حکم اور ہر فیصلہ ہو سکتا ہے۔ قرآنیات کے طالب علم کو شروع میں ایک دشواری یہ پیش آتی، لیکن قرآن ہی کی برکت سے بجا اللہ عمل بھی ہو گئی۔

نتیجہ ۲

اسی طرح تیسرے رکوع کا شروع حکم قویہ سے ہوتا ہے، اور اس کے معانی کی آیت میں بیان ایجاز و اجمال کے ساتھ خلقت کائنات کا ہے:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

”وہ وہی پروردگار ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو

چھت اور اس نے اُتارا آسمان سے پانی۔ اور پھر (اس نے) تمہارے لئے

غذا کو بھل پیدا کر دیے۔ سو تم اللہ کا (کوئی) ہمسر نہ ٹھہرانا۔ اور تم جانتے

(نہ جھٹکتے) بھی ہو۔“

یہاں زمین و آسمان کی نہ ہمیت کا بیان ہو رہا ہے، نہ ان کی ماہیت ارضیاتی و فلکیاتی کا۔ ان علمی اور فنی یا سائنسی پہلوؤں سے یہاں مطلق بحث نہیں۔ قرآن نے یہاں دونوں کا ایک ایک وصف امتیازی چُن لیا۔ اور ان ہی کے بیان پر اکتفا کر لی۔ زمین کا وصف تو یہ

بیان کیا کہ وہ انسان کے لئے بمنزلہ فرش ہے۔ وہ گول ہو تو، اور چوکھنٹی ہو تو، ہر صورت میں انسان کے پیروں کے نیچے ہے، انسان اس پر چاہے چلے پھرے، بیٹھے لیٹے، دوڑے یا سوئے بہر حال میں یہ اس کے نیچے فرش کا کام دے گی، اس پر جو سواری بھی اس کا جی چاہے چلائے، گھوڑے اور خچر، اور بیل اور اونٹ اور سائیکل اور ریل اور موٹر۔ بہر حال میں وہ اسے سنبھالے رہے گی اور اس کا بوجھ اٹھائے رہے گی۔ انسانی ضرورتوں کے لئے یہ ٹھوس اور ہموار اور سطح ہے، نہ کھردری، نہ پیلی، نہ کھوکھلی نہ پچھلی، کہ بیٹھ جائے یا دھنس جائے۔ یا اپنے اندر نکل لے۔

اسی طرح السماء کا وصفِ خصوصی اس کی بلندی کو چُن لیا اور الارض کی پستی یا فرشتہ کے مقابل اس کی بلندی یا رفعت کو بیان کر دیا۔ کہ وہ تو انسان کے لئے بمنزلہ چھت کے ہے۔ اس کے ٹھوس اور خول ہونے سے یہاں مطلق بحث نہیں۔ بحث صرف اس سے ہے کہ وہ سب سے بلند چیز ہے۔ چھت کی طرح نسل انسانی کو ہر طرف سے ڈھانپے ہوئے۔ انسان جتنا بھی چاہے اچھلے کودے، جس بلند سے بلند پہاڑ کی چوٹی پر چاہے چڑھتا چائے، ہوا میں جتنی بھی اڑان دکھائے، خلا میں زیادہ سے زیادہ قلابازیاں کھاتا رہے۔ بہر حال آسمان کے نیچے ہی رہے گا۔ کسی صورت میں اس سے باہر نکل کر نہ جاسکے گا۔

تیسری بات آیت میں یہ بیان کر دی کہ انزل من السماء ماء کہ آسمان سے پانی اسی پروردگار نے اتار دیا ہے۔ یہ معنی اس کے ہرگز نہیں کہ چھت کے اوپر، پانی کا لامحدود ذخیرہ کوہ قامت ٹینکیوں کے اندر محفوظ ہے۔ اور اللہ ان کی ٹونیاں جب چاہے کھول کر زمین پر پانی برسا دیتا ہے۔ یہ بھی اللہ کیلئے بالکل آسان ہوتا۔ سوال امکان کا نہیں، واقعہ کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنس کی کتابوں نے جو لمبا اور سلسلہ وار طریقہ بیان کیا ہے یعنی سمندر کے پانی کا گرمی پا کر بھاپ کی شکل میں تبدیل ہونا، اس کا بادل کی شکل

اختیار کر کے اوپر اٹھنا، ہواؤں کے سہارے فلاں اور فلاں سمت میں منتقل ہونا، اور فلاں درجہ کی حرارت یا کہ پانی کی بوندیں یا قطرے بن جانا، پھر فلاں مقدار میں نازل ہونا وغیرہ۔ اس ساری داستان مفصل و مطول کا خلاصہ و ماحصل دو لفظوں میں بیان کر دینا قرآن ہی کا اعجاز ہے، اس کو درمیانی واسطوں اور سلسلہ اسباب سے کوئی بحث نہیں۔ یہ کام تو مادی مشاہدوں اور تجربوں سے لینا تو عقل کے سپرد کر دیا گیا ہے، اور علوم طبعی کے حوالہ قرآن مجید نے تو صرف اتنا بتا دیا کہ پانی برسانا کام اللہ ہی کا ہے، نہ کہ کسی اور کا، جس طرح اس نے زمین کی فرشیٹ اور آسمان کی بلندی کی تخلیق کو اپنی جانب منسوب مخصوص کر لیا تھا۔

چوتھی بات آیت میں یہ بتائی کہ "فَاَخْرَجَ مِنْهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ" اس نے پانی کے ذریعہ تمہارے لئے غذا کو پھل اُگا دیے۔

الثمرات کے تحت میں غلے، ترکاری، ساگ پات اور پھل پھلاری، سب ہی زمین سے اُگنے والی غذا میں آگئیں۔ سائنس کے کسی بیان سے قرآن کا کہیں ٹکراؤ نہیں۔ قرآن نے تو بس اتنا بتا دیا کہ کائنات میں جو کچھ اور جس طرح بھی ہو رہا ہے، جو کچھ بھی تمہاری آنکھیں دیکھتیں اور تمہارے حواس محسوس کرتے ہیں، یہ ساری کاریگری اور صنعت اور تخلیق دونوں عالم کے پروردگار ہی کی ہے۔ اور آیت کا توڑ اس پکار پر کیا ہے کہ:-

فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

”اللہ کا ہمسر کسی کو بھی نہ ٹھہراؤ (نہ کسی انسان یا جن یا فرشتہ کو، نہ کسی چرہ

پرند حیوان کو، نہ کسی دریا یا پہاڑ کو، نہ کسی سائنسی فارمولے یا طبعی قانون قاعدہ

کی کسی دفعہ کو) اور تم جانتے ہو جھٹکتے بھی ہو۔“

یعنی اتنی موٹی حقیقتیں تو عام فہم ہیں۔ انسانی فہم پر روشن و واضح۔ یہ کوئی دقیق و غامض

علمی نکتے اور عقلی اسرار و رموز نہیں۔

آفرینش کائنات و اجزاء کائنات سے متعلق قرآن کا عام انداز بیان یہی ہے کہ وہ اسباب و جزئیات اسباب کی طرف نہیں جاتا بلکہ سارا زور خالق و مخلوق کے ربط و تعلق پر دیتا رہتا ہے، اور گھوم پھر کر ذہن انسانی کو اس نقطہ پر لاتا ہے کہ ایک خالق کل ناظم کل، حاکم کل، قادر کل کو مان لینا آسمان تر اور زیادہ قرین عقل ہے، یا ہزار ہا ہزار وسائل کے جنجال میں پڑے رہنا؟

————— ۳ —————

قرآنیات کے طالب علم کو ایک اور دھچکا اس وقت پہنچتا ہے، جب وہ سورہ بقرہ کے چھٹے رکوع کے شروع میں اس آیت پر پہنچتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
وَ اِنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آیت ۴)

”اے بنی اسرائیل میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا۔ میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی۔“

اور اسی مفہوم کی اور آیتیں بھی آگے چل کر قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ بنی اسرائیل کو عام طور پر مرادف یہود کے سمجھا گیا ہے اور جس انعام کو یاد دلایا گیا ہے اس انعام سے مراد دنیوی انعام، ملک و مال، دولت و شوکت سمجھا گیا ہے۔ یہ مفہوم لے کر اب تاریخ کے اوراق سے سوال ہوتا ہے کہ یہ بے مثل و بے نظیر اقبال اس کے کس دور میں اور عالم کے کس خطہ میں یعنی کب اور کہاں حاصل رہا ہے؟ یہود کی نفس اقبال مندی میں شبہ ذرا نہیں۔ بڑے سے بڑے نیک و سلطان اس قوم میں ہوئے ہیں۔ بڑے سے بڑے ساہوکار اور سرمایہ دار اس میں گزرے ہیں۔ سوال اس کا نہیں، سوال اس قوم کے سب سے بڑھ چڑھ کر ہونے کی بابت ہے۔

کیا ایسے با اقبال افراد اس قوم میں ہوئے ہیں ؟ دوسری ترقی یافتہ قوموں میں نہیں ہوئے ہیں ؟ سوال اس قوم کے بے نظیر ہونے کی بابت ہے۔ قرآن نے جو صراحت کے ساتھ انھیں افضل ترین اقوام عالم کہہ دیا ہے تو نبوت عیسیٰ صدی عیسوی کا طالب علم قرآن کے اس دعوے کا مانگتا ہے، اور نشان دہی متعین ملک و زمانہ کی چاہتا ہے۔

جواب سے پہلے دو تاریخی حقیقتیں ذہن نشین کر لیجئے اور جواب بالکل اہل ہو کر سامنے خود بخود آجائے گا۔

پہلی بات یہ کہ بنی اسرائیل کوئی مذہبی اصطلاح نہیں، یہ ایک نسلی نام ہے۔ اس قوم کا لقب، جو یعقوب معروف بہ اسرائیل بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی نسل سے پیدا ہوئی۔ اور اپنے وطن شام سے نکل کر پھر اطراف عالم میں پھیلی۔ ظہور اسلام اور بعثت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں نبوت رسالت جہاں کہیں بھی نکلی نسلی و قومی ہی تھی۔ آفاقی اور تمام تر اعتقادی تو دنیا میں پہلی بار ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے ہوئی ہے۔ خاندان یعقوب کی اصل فضیلت یہ تھی کہ جہاں اسے عزت و حکومت سے نوازا گیا، وہیں اس کے اندر انبیاء بھی پیدا ہوئے اور اسے شرف رسالت سے بھی مشرف کیا گیا۔ وَجَعَلْنَا فِيكُمْ رُسُلًا (نائدہ آیت ۲۰)، اس معنی پر دال ہے۔

دوسری بات یہ کہ دنیوی سروری اور سرداری، ملک گیری اور ملک داری کے انعام میں، ایران و ہند، عراق و چین، یونان و مصر کے بہت سے افراد شریک و شہم سہمے ہیں لیکن شرک و مخلوق پرستی کی آلائش سے ان میں سے کوئی بھی قوم محفوظ و مستثنیٰ نہ رہی۔ آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی، انجم پرستی، مورتی پوجا وغیرہ ہر ملک میں ایک ضمیمہ علوم و فنون تہذیب و دانشگری کا بنی رہے اور دیوتا، اوتار، بلکہ انگریزی اصطلاح میں ہیرو گارڈ (Hero God) کا عقیدہ تقریباً ہر مذہب یا دھرم کا جزو لاینفک رہا کیا ہے۔

اور تاریخ کے دور میں صرف ایک ہی قوم عقیدہ توحید کی علم بردار رہی اور خالص پرستی کی تلقین کرتی رہی۔

قرآن نے جس انعام خصوصی کا ذکر اس قوم کے سلسلہ میں بار بار کیا ہے اور اس میں اس کا شریک و ہم کسے دوسری قوم کو نہیں گردانا ہے، وہ یہی نعمت توحید ہے، اور بار بار اس امتیاز خصوصی کا ذکر کر کے اس ناشکر گزار قوم کو بتایا ہے کہ صدیوں تک اس نعمت خاص کی بارش تمہارے اوپر ہوتی رہی، تم ہی کو اس دعوت کا نقیب، پشتہا پشت تک رکھا گیا ہے۔ اور اب بالآخر اتمام حجت کے بعد تمہارے مسلسل کفرانِ نعمت کی پاداش میں یہ نعمت تمہارے خاندان و نسل سے سلب کی جاتی ہے۔ اور دین توحید آج سے بجائے نسلی یا قومی مذہب کے، ایک سنیعی پیسے کے واسطے دین انسانی یا عمومی کیا جاتا ہے۔ ہر نسل و قوم کے لئے جو بھی صحیح عقیدہ کا اتباع کرے اور توحید و رسالت کا قائل ہو جائے۔ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ کے اس صحیح مفہوم پر جس کسی کی نظر پہنچ جائے گی، اس کا بجائے کسی شک و اشتباہ کے، قرآن کی تاریخت پر ایمان کس قدر مستحکم تر ہو جائے گا!

ہمارے جو مفسرین یہود اور بنی اسرائیل کو مراد سمجھے ان کے ہاں ایک سوال امت موسوی اور امت محمدی کے درمیان تقاضیل کا پیدا ہو گیا ہے، حالانکہ دونوں کے مفہوم کا فرق اگر واضح رہے، تو سرے سے تقابیل و تقاضیل کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ امت محمدی ظاہر ہے کہ نام کسی نسل یا قوم کا نہیں بلکہ وہ تو ایک خاص عقیدہ کے ماننے والوں کا نام ہے، خواہ وہ کہیں کے باشندے ہوں اور کوئی سا بھی نسب رکھتے ہوں۔

————— ﴿۴﴾ —————

ای رکوٰۃ میں ذرا آگے چل کر آیت پچاس میں بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے

بلکہ آج کل کی سیدھی ہموار پختہ سڑکیں بھی موجود نہ تھیں اور یہ عجبت اور گھبراہٹ اس پر
مستزاد کہ رات رات ہی حدود مصر کو پار کر لیں۔ شب کی تاریکی میں اگر اسرائیل راہ بھولی گئے
ہوں تو تعجب اس پر ذرا نہ کیجئے۔ فرعون کو خبر ہو گئی اور وہ خود اپنی کمان میں لشکر جرار لے کر
تغاقب کو چڑھ دوڑا۔ زمانہ کا تعین چزم کے ساتھ مشکل ہی ہے تاہم اکثر محققین کا رجحان یہ ہے کہ
قبل مسیح کے وسط کی جانب ہے بلکہ بعض مثلاً سرچارلس مارسلٹن نے تو جرات کر کے سنہ
بھی متعین کر دیا۔ ۱۲۴۷ قبل مسیح۔

— (۵) پتہ: —

تاریخ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قرآن مجید تذکرہ تو بہت سے واقعات کا کر گیا
ہے کہیں صراحتاً اور کہیں اشارتاً، لیکن کم سے کم ایک واقعہ ایسا ہے جس کے لئے ذہن میں
ضرور گمبید پیدا ہوتی ہے، ارشاد ہموار ہے بنی اسرائیل ہی سے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا
لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ (آیت ۶۵)

”تم خوب جانتے ہو ان لوگوں کو اپنے میں سے جنہوں نے سبت کے بائے

میں حدود سے تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بن جاؤ۔“

عَلِمْتُمْ کے معنی خود ہی یہ ہیں کہ مخاطبین کے سامنے ان کے کسی جانے

بوجھ واقعہ کا ذکر ہموار ہے اور اس پر لکھنا سہل ہے اور قد حشر

تاکید کا مزید اضافہ۔ گویا تاریخ اسرائیل کا کوئی خوب ہی معروف و متعارف واقعہ

جس سے موجود الوقت اسرائیل کو مجال انکار نہیں۔ سبت یا ہفتہ کا دن ان کے ہاں

بہت محترم تھا اور احترام سبت کے احکام ان کے ہاں نہایت درجہ تاکید تھے۔

ذکر حال کسی ایسے واقعہ کا ہموار ہے جو سبت شکنی کرنے والوں اور احکام سبت کی بھڑتی

کرنے والوں پر بطور سزا کے نازل ہوا تھا، اور پھر بد توں ان کی قوم میں یہ بطور عبت و
 معظمت زبان زد عام رہا۔ گرید یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایسا اہم واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟
 مجاہد کوئی معمولی اور متاخر شخص نہیں، تابعی ہوئے ہیں۔ اور تابعی بھی ایک ممتاز درجہ
 رکھنے والے۔ توجان القرآن۔ ان سے یہ قول ابن جریر وغیرہ میں منقول چلا آ رہا ہے کہ
 انسانوں کا یہ مسخ صورتاً اور حیثاً نہیں ہوا بلکہ محض سیرت و کردار، عادات و خصائل کے لحاظ
 سے وہ ذلیل بند بنائے گئے جیسا کہ قرآن ہی میں سورۃ الجمعہ میں یہودی ہی کو گدے
 سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کَمَثَلِ الْجَمَارِ۔ اور راغب کے مفردات القرآن میں بھی
 ایک قول ایسی معنی میں نقل ہوا ہے۔ اس مفہوم کو تسلیم کر کے قدرتا و قسرا
 استبعاد از خود رفع ہو جاتا ہے اور ذہن کو کوئی خاص حیرانی نہیں رہ جاتی۔ پھر بھی کر
 کہاں کے سوال کسی درجہ میں تو باقی ہی رہ جاتے ہیں۔

ان دونوں سوالوں کا جواب ثقہ اور سنجیدہ اسلامی روایتوں میں ملتا ہے کہ
 حضرت داؤدؑ کے زمانہ کا ہے اور آپ کا زمانہ جدید تحقیق کے مطابق ۱۰۱۳
 سے لے کر ۹۳۷ھ تک رہا ہے اور مقام کا نام جس کا پتہ قرآن نے حَاضِرَةُ الْجَزْ
 کہہ کر سورۃ الاعراف میں دے دیا ہے یعنی ساحل سمندر پر ایلہ آیا ہے۔ توریت میں
 اس کا نام ایلات (Elath) صحیفہ (استثناء باب دوم آیت ۸) اور موجودہ
 جغرافیہ میں اس کا نام خلیج عقبہ کا مشہور بندر گاہ عقبہ ہے۔

————— (۶) پتہ: —————

ایک بڑے اچھے میں مسلمان کو ڈالنے والا مقام قرآن میں وہ ہے جہاں حضرت
 سلیمانؑ کی صفائی کفر سے پیش کی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيْطٰنَ كَفَرُوْا (رکوع ۱۲، آیت ۱۰)

”سیمان نے تو کبھی کفر نہیں کیا، البتہ شیطان کفر کرتے تھے۔“

سیمان کو قدرِ ثناء یہ پڑھ کر کھٹاک پیدا ہوتی ہے کہ سیمان تجسّسِ برحق تھے تو یہ کہنے والی کون سی بات تھی کہ آپ کفر کے مرتکب نہیں ہوئے، کفر کر کے کوئی مومن ہی کب باقی رہ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ پیمبر اس کا ارتکاب کر سکے! دل کی کھٹاک بجا ہے اور اس وقت تک باقی رہے گی، جب تک یہ نہ سُن لیا جائے کہ دو دو بڑے اور صاحبِ کتا مذہبوں نے آپ کو اپنی کتاب میں نعوذ باللہ دینِ توحید سے مرتد اور بے دین قرار دیا ہے۔ غبدِ یثیق کے صحیفہ ۱۔ سلاطین کی عمارت ملاحظہ ہو:-

”جب سیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جو روؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کال نہ تھا؟“ (باب ۱، آیت ۲۴، ۲۵ اور اسی صحیفہ کی دو مین آیتیں اور بھی:-

”سو از بسکہ اس کا دل خداوند کی طرف سے برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند سیمان پر غضب ناک ہوا، کہ اس نے حکم دیا تھا کہ وہ منجی معبودوں کی پروردی نہ کرے، پھر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔“ (سلاطین ۱۱، ۹، ۱۰) یہ اور بات ہے کہ محققین جدید کی تحقیقات بھی بائبل سے کہیں زیادہ قرآن کی تائید میں آ رہی ہیں اور ان کے اہل حوالے خاکسار کی تفسیر میں دُج ہو چکے ہیں۔

غمنما قرآن مجید نے یہ بھی بتا دیا کہ ساحرانہ اور کافرانہ حرکتیں آپ کے عہد میں تو شیاطین جن و انس ہی کرتے تھے، اور انھیں منسوب آپ کی جانب کر دیتے تھے قرآن مجید میں یہاں لفظ شیاطین بصیغہ جمع آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد ابلیس تو ہو نہیں سکتا۔ لا محالہ شیطان مجازی ہی مراد ہوں گے۔ یعنی شیطان صفت انسان یا جنات، جو طرح طرح کی شیطانی حرکتیں کرتے رہتے اور ملک میں فتنہ و فساد پھیلاتے رہتے تھے۔

”سحر و کھانت، ٹوسنے ٹوٹکوں، نقش و گندڑوں کا زور جو یہود کے ہاں رہا ہے اس

اُن کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ قرآن مجید اس کی تصدیق کیوں کرتا ہے؟
 يَعْلَمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ: لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔ اور اس
 سے متاثر ہو رہے ہیں:

وَالَّذِينَ الشَّيْطَانُ كَفَرُوا (کفر تو شیطان کرتے تھے) اس کا اظہار
 ہوا مطلب یہ ہے کہ کفر تو شیطان کرتے تھے اور وہی لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔ لیکن
 ایک دوسری ترکیب یہ بھی جائز سمجھی گئی ہے کہ فاعل بجائے شیطان کے یہود کو قرار دیا جائے
 یعنی اس فقرہ قرآنی کو جو ذرا پہلے آچکا ہے، فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ کو
 علامتِ تہ اس صورت میں بھی دہی نکلتا ہے، یعنی عہدِ سلیمانی کے شیطان صفت یہود سحر آرمی
 اور سحر کے چپے میں مشغول تھے۔

ان تصریحات کے متا بعد قرآن مجید میں ہے:-
 وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِ بَابِلَ مَا دُوتَ وَمَا دُوتَ (۱۲۶، البقرہ)
 "اور وہ نیچے لگے اس (علم) کے جو بابل میں دو فرشتوں (امت و
 امت) پر اُتار دیا گیا تھا۔"

بابل جس ملک کا نام ہے اس کو اب عراق عرب کہتے ہیں اور اسی کا ایک قدیم نام
 کلدانہ یا کلدانہ بھی ہے۔ اس کی شہرت علومِ سحریہ میں اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ انگریزوں
 میں کالڈین مراد ہی ساحر کا ہو گیا ہے، اور دو فقروں کے عطف سے یہ لازم نہیں آتا کہ
 سحر فلسطینی اور سحر بابلی کا عروج ایک ہی زمانہ میں رہا ہو، بلکہ بیان و سباق قرآنی میں صاف
 گنجائش اس کی موجود ہے کہ دونوں ملکوں کے عروجِ سحر کا زمانہ الگ الگ ہو لیکن یہود کی
 ہمارے سحر دونوں قسم کے سحر میں مشترک رہی ہے۔

اور وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ میں لفظ اُنْزِلَ سے کسی کو دھوکا
 نہ ہو، کہ یہ شرفِ تعلیم کا لفظ سحر کی سی حرام چیز کے لئے کیسے لایا گیا۔ "نزول" و "انزال"

عربی میں موقعِ شرف و تعظیم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تکوینی حیثیت سے جو شے بھی اللہ کے ہاں سے اور فرشتوں کے واسطے سے آتی ہے، سب پر اطلاق عام اس سے کہ وہ خیر ہو یا شر، نازل و انزال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ فعل رزق (دروزی) کے ساتھ آیا ہے، اور ماء (پانی) کے ساتھ، اور انعام (چوپایوں) کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دَجَز (غذا یا بلا) کے ساتھ بھی۔ سورہ عنکبوت کی آیت ۳۲ میں اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰی اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ اور ایک سحر ہی پر کیا موقوف ہے، کائنات میں نور و ظلمت، خیر و شر، حق و باطل، طاعت و معصیت میں سے جو کچھ بھی موجود ہے سب کا وجود تکوینی حیثیت سے سبب الاسباب ہی کے نازل کرنے سے تو ہوا ہے۔ اور سحر کے لئے یہاں انزال اپنے اسی وسیع معنی میں آیا ہے یعنی یہ بات ان کے دل میں ڈال دی گئی، کوئی اظہارِ شرف و تکریم مقصود نہیں یہی طرح کوئی ہجرت فرشتوں کے ذکر پر بھی نہ کیجئے، ایک سحر کیا معنی، کفر و شرک، کوئی گندہ سے گندہ کام بھی تکوینیات کے سلسلہ میں ہو، آخر فرشتوں ہی کے واسطے یا وسیلہ سے تو لیا جاتا ہے اور یہ امر فرشتوں کی برگزیدگی و معصومیت کے ذرا بھی منافی نہیں۔

بابل والوں کے سحر پر علاوہ تاریخی شہادتوں کے گواہی خود عبدعزیز کی موجود ہے چنانچہ صحیفہ دانیال (باب ۴، آیت ۳) اور صحیفہ مکاشفہ (باب ۱۰، آیت ۵) اور باب ۱۸، آیت ۳۰ وغیرہ میں صراحتیں درج ہیں۔ اور ایک جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلدانیوں کی فرد جرم کا سرعنوان یہی جرم سحر کاری تھا۔ صحیفہ مکاشفہ میں ہے،

”تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے، تیری جادوگری سے ساری قومیں گمراہ ہو گئیں اور نبیوں اور مقدسوں اور زمین کے سب مقتولوں کا خون اس میں

بہا یا گیا۔“ (باب ۱۸، آیت ۲۳، ۲۴)

قرآن مجید میں یہ سارا مذکورہ اس تاریخ اسرائیل کے قصہ میں لایا گیا ہے اور گویا یہود عرب پر

حجت قائم ہو رہی ہے کہ سحر و کھانت کی پلیدی سے تولد ہوئے ہو اور تاریخ کا کوئی سا دور ہو، یا زمین کا کوئی سا قطعہ ہو، فلسطین ہو یا بابل، تمہارے ہاتھ تو برابر اس جرم سے رنگین رہے ہیں۔

مَلَكَيْنِ (بالفتح) کی ایک قرات اگرچہ مَلَكَيْنِ بھی ہے کسرہ لازم کے ساتھ اور اس بنا پر اہل تفسیر کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ یہ دونوں اصلاً فرشتے نہ تھے بلکہ بشر تھے اور بادشاہ۔ اور انھیں جو دوسری روایتوں میں فرشتہ کہا گیا ہے تو صفاتی حیثیت سے۔ یعنی ان ملکوتی صفات کی بنا پر۔ لیکن جمہور کا قول اس قرات مشہور کی بنا پر ان کے فرشتے ہی ہونے کا ہے۔ اور کسی خاص تشریحی مصلحت کے کسی خاص موقع پر اور کبھی امر و نہی ہی کی تفتیح و تحقیق کی غرض سے کسی فرشتہ کو انسانوں کے درمیان رہنے سہنے کے لئے بشری جذبات و خصائل سے موصوف کر کے بھیج دیا گیا تو اس سے کوئی بھی قباح لازم نہیں آتی۔ خصوصاً جب کہ مقصود ہی سحر و کھانت کا ابطال و استیصال ہو۔ آخر نبوی حکومتوں میں تو دوزخ و مزہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مجرموں کی سرشاری اور گرفتاری میں، اور جرائم کے قلع و قمع کی خاطر، پولیس کانسٹیبلوں ہی کو نہیں، بڑے بڑے سرکاری افسروں کو بھی کیسے کیسے طریقہ مجرموں ہی کے سیکھنے پڑتے ہیں اور خود کیسے کیسے مصنوعی اور نقلی جرائم کا ارتکاب کرنا ہوتا ہے۔ بات رد کفر سلیمان سے شروع ہوئی تھی اور پھر بات میں بات نکلتی آتی، یہاں تک کہ بہت سی الجھنیں ایک ہی سلسلہ کی صاف ہو گئیں۔

————— ❦ —————

اسی قصہ سلیمانی کے ضمن میں اور گویا محض اتفاقہ اور لپیٹ میں، قرآن اسرائیلیوں کی ایک اور بھی خصوصیت بیان کر گیا ہے اور وہ بھی سننے کے لائق ہے۔ یہ فرشتے سحر کے گرگسی کو بلا ضرورت بتاتے ہی نہ تھے، اور جب ضرورتاً بیان کرتے

بھی تو یہ ضرور تنبیہ کر دیتے کہ ہم تو امتحان کے لئے بھیجے گئے ہیں، تم کہیں واقعہ اور عقیدہ
سحر کو نہ اختیار کر لینا، ورنہ اس طرح کافر ہو جاؤ گے۔

وَمَا يُعَلِّمِينَ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَ إِنَّمَا غَنُّ فَتْنَةٌ فَلَآ
تَكْفُرُوا (رکوع ۱۲، آیت ۱۲)

”اور وہ دونوں کسی کو بھی فن کی باتیں نہ بتاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے
کہ ہم لوگ تو بس ایک ذریعہ امتحان ہیں، تو کہیں تم کفر نہ اختیار کر بیٹھنا۔

”و تعلم“ یہاں باقاعدہ درس دینے کے مفہوم میں نہیں، محض اطلاع یعنی بتلانے
بتانے، بتانے کے معنی میں (جیسا کہ صاحب معالم التشریل و صاحب بحر المحیط وغیرہ نے
کہا ہے) خود ایک قرآنی قرأت متواتر میں بھی تخفیف لام کے ساتھ مصدر اعلام سے
آئی ہے۔

لیکن اس شدید و صریح انتباہی ہدایت کے باوجود بھی ایک خاص قسم کے نقش او
گنڈے یعنی میان بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے والے یہ لوگ ضرور ان سے سیکھ لیتے۔
ارشاد ہوتا ہے :-

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ
وَذَوْجِهِ (رکوع ۱۲ - آیت ۱۲)

”مگر لوگ ان سے سیکھ لیتے ہیں کہ وہ جدائی ڈال دیتے درمیان مرد
اور اس کی زوجہ کے۔“

قرآن مجید کو آخر اس مخصوص نوعیت کے جھاڑ پھونک کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟
اس کے جواب میں عرب کے ایک اٹمی کے لائے ہوئے کلام کو نہیں، بلکہ یہ دیکھئے
کہ بیسویں صدی کے آغاز کے علماء یہود اور محققین اسرائیل اپنے اسلاف و اجداد کے مشغلہ سحر
و ساحری اور اعمال سفلیہ سے متعلق کیا کہتے ہیں، بلکہ شش ہوش سماعت فرمائیے :-

”سحر کی سب سے زیادہ عام و متداول صورت اس نقش کی تھی جو عشق و محبت کے لئے دیا جاتا تھا۔ خاص کردہ نقش جو ناجائز آشناؤں کے لئے لکھا جاتا تھا۔ اس قسم کے سحر کی ماہر عورتیں ہی زیادہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ ذکر بھی سحر اور حرام کاری کا ساتھ ہی ساتھ آیا ہے۔“

یہ حوالہ ہے جیوش انسائیکلو پیڈیا کی جلد ۸، صفحہ ۲۵۵، کالم اول کا۔

— جز ۸ —

پارہ اول کے ثلث کے بعد حکم استقبالِ قبلہ کی تہید شروع ہوتی ہے۔ ابھی تک کوئی حکم قبلہ قرآن مجید میں نازل نہیں ہوا تھا۔ ہام اہل مذہب اپنے اپنے خدا کو مجسم اور کسی سمت کے ساتھ مقید، اور کسی مکان کے ساتھ مخصوص و محدود مانتے تھے اور خدا کے تلبس سے اس خاص سمت کو بھی مقدس ماننے لگے تھے۔ قرآن مجید میں جو پہلا ارشاد اس بارے میں وارد ہوا ہے، اس میں سب سے پہلے اس غلط تصور کی اصلاح کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-
 وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ
 اِنَّ اللّٰهَ وَّاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ (دکوع ۱۲- آیت ۱۱۰)

”اشتر ہی کا مشرق بھی ہے اور مغرب بھی، سو تم جہر کو بھی منہ پھیر دین اور
 ہی اشتر کی ذات ہے۔ بیشک اشتر بڑا وسعت والا، بڑا علم والا ہے۔
 یعنی کیا بحیثیت مخلوق، کیا بحیثیت ملوک، کیا بحیثیت مربوب، ساری سمتیں یکساں اور ہم مرتبہ
 ہیں، کسی میں کوئی جلوہ تقدیس، کوئی شائبہ الوہیت موجود نہیں، جس طرف بھی نظر پھیرو گے
 اشتر ہی کے انوار نظر آئیں گے۔“

اُس خدا سے واحد کی ذات ہر مکان، ہر طرف کی محدودیت سے پاک اور ہر سمت
 بہت سے منزہ ہے، اس کی تجلیات ہر رخ پر یکساں پائے گئے۔ البتہ جو اہمیت اب آفاقی

اور عالمگیر پیدا کی جا رہی ہے، اس میں مرکزیت اور یک جہتی کی خاطر کوئی قبلہ نما بنا دیا جائے گا۔ وہ ذاتِ لا محدود بے پایاں تو خود ہی ہر طرف، ہر مکان کو اپنے اندر لئے ہوئے گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی سمائی بھلا کس طرف و مکان میں ہو سکتی ہے؟ ہاں! وہ لامکان اور ماوراءالظرف اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے اس موحدِ اُمت کے لئے دعا و عبادت کی غرض سے جو بھی قبلہ، جو بھی نقطہ مرکزیت چاہے مقرر کر دے۔ اس میں دخل کسی سمت کی ذاتی قدوسیت کو ذرا بھی نہیں۔

زمین استقبالِ کعبہ کے لئے قرآن نے اس آیت میں تیار کر دی۔ کعبہ رخی اور مسائل متعلقہ معروضات آگے سنئے گا۔

————— ﴿ ۹ ﴾ —————

معا بعد جو آیت آتی ہے اُس میں ذکرِ مسیحی شرکِ عیسیٰ، مسیح کی فرزندئی رب کا

ہے۔ الفاظ یہ ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۚ سُبْحٰنَهُۥٓ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِیْنُوْنَ ۝ (آیت ۱۱۱، رکوع ۱۴)

اور نصرا نیوں نے کہا کہ اللہ نے ایک بیٹا بنالیا ہے۔ پاک ہے وہ! اصل یہ ہے

کہ اس کی ایک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اُسی کے فرمان بردار ہیں۔

یہی صریح حاققت ہے کہ اللہ سے اس کی کسی بھی مخلوق کا رشتہ انبیت یا تبیت کا

قائم کیا جائے۔ سب اس کی مشیتِ تقدیری و تکوینی کے آگے جھکے ہوئے ہیں رایت میں

جو لفظ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ہے، اس کا ترجمہ ہے اللہ نے اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ اس کے

بیٹا ہے نہیں، بلکہ بیٹا بنالیا ہے یا عوامی محاورہ میں گود لے لیا ہے! عرب کے ایک

امی کے سنائے اور چلائے ہوئے لفظ خیال میں رکھیئے، اور پھر ایک سرسری نظر، مسیحی ضلالت

کی قرب کی ہوئی "تاریخ مسیحیت پر کر لیجئے۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک بڑا فرقہ ان میں
 ملتا ہے ADOPTIONISTS اتحادیہین کے نام سے۔ اس کا مرکزی عقیدہ
 یہ نہیں کہ مسیح خدا کا جنا ہوا، پیدا ہوا، بلکہ گویا خدا نے کامل و مکمل انسان کو اپنا بیٹا
 کر لیا ہے۔ اور اسی عقیدہ کی شرح یہ ہے کہ مسیح نہ خلق خدا میں نہ وہ شروع سے بنے بنائے
 ترشے ترشائے خدا پیدا ہوئے۔ وہ اصلاً بشر ہی تھے۔ البتہ اقنوم ثالث یعنی روح القدس کا
 فیضان ان پر شروع سے پڑنے لگا اور ان سے وہ قدوسیت کے ایسے اوج کمال پہنچ
 گئے کہ اقنوم اول، خدا سے برتر و اعظم نے انھیں اپنی ابنیت میں لے لیا اور شریک الوہیت
 کر لیا۔ اور اب وہ ربوبیت، مالکیت وغیرہ سارے صفات الہی میں شریک و شریک ہیں۔ انھیں
 صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اس عقیدہ کو اکاد و زندہ قرار دیا۔ اور بارہویں صدی
 عیسوی میں اس فرقہ نے پھر زور پکڑا۔ ہمارے مسلمان مفسرین اور خادمانِ قرآن سے
 اگر کہیں کوئی چوک مطالعہ مسیحیت کے دقائق میں رہ گئی ہو تو اس میں ان بچاروں کا کیا قصور؟
 آخر وہ قرآن کی ہر دانی، ہر گیری کہاں سے لاتے؟

————— ۱۰ —————

تاریخ بنی اسرائیل کے اہم عنوانات گنا کر سو لہویں رکوع کے شروع میں پھر وہی مضمون
 دہرایا ہے، جو اسی تاریخ کے سلسلہ میں چھٹے رکوع میں ارشاد ہوا تھا۔
 يٰبَنِي إِسْرَآئِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
 وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (آیت ۱۱۷، رکوع ۱۵)
 اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمتیں جو میں نے تمھیں بخشی تھیں اور یہ کہ میں نے
 تمھیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی تھی۔
 گویا یہاں خاتمہ پر دو باتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

ایک یہ کہ جب تک نسلی و قومی بنوتوں اور رسالتوں کا دستور قائم رہا، سب سے برگزیدہ اور مقبول قوم اسرائیل ہی کی رہی۔ کسی دوسری قوم کو بحیثیت قوم موقد ہونے کا شرف حاصل نہ تھا۔

دوسری بات یہ کہ خدائی تمہربانی کوئی ایسی شے نہیں ہوتی، کہ کسی قوم پر بہر حال و بہر صورت چکی رہے، یہ شرط ہوتی ہے۔ بندے جب تک اداۓ شکر کرتے رہتے ہیں نعمتیں اور انعام اُن پر قائم رہتے ہیں، لیکن جب اس کے بجائے ناشکری اور نافرمانی مسلسل ہونے لگتی ہے اور اپنے ہی پیغمبروں سے سرکشی و بغاوت حد سے بڑھ جاتی ہے، تو بالآخر وہ نعمتیں سلب بھی ہو جاتی ہیں اور وہ انعام پائے ہوئے اب محروم رہ جاتے ہیں۔
یہ گہری اور مستقل حقیقتیں ہیں ہر موقع پر کام آنے والی۔

=====

اس کے بعد ذکر حضرت ابراہیمؑ کا شروع ہوتا ہے اور اس ذکر کے بعد کہ آپؐ کا امتحان جن چیزوں میں لیا گیا اور آپؐ جب خدائی امتحان میں پورے اُترے تو آپؐ کو انعام یہ ملا کہ دنیا کی امامت آپؐ کے سپرد کی گئی۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (رکوع ۱۵ - آیت ۱۹)

اشر نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔

اور امامت سے مراد اصطلاح قرآنی میں سلطنت و حکومت، جاہ و مال نہیں بلکہ دینی و روحانی پیشوائی ہے۔ اور توریت میں بھی یہ وعدہ انعام الہی دہرایا گیا ہے، گو قرآن کا جامع و بلیغ لفظ ”امام“ اُس میں موجود نہیں۔ صحیفہ پیدائش میں ہے :-

”اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا، اور تو ایک برکت ہوگا، اور ان کو جو تجھے برکت دیں برکت دوں گا،

اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کر دوں گا، اور دنیا کے سارے گھرانے

نمجھ سے برکت پائیں گے۔ (باب ۱۲، آیت ۱ و ۲)

یہ وہی امامت ہے جو آج تک ابراہیم کے حصہ میں چلی آرہی ہے، اور اسلام کے علاوہ بھی جو مذہب توحید سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں، یعنی یہودیت اور خرائیت، وہ آپ کی امامت منسلک رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک نامور فرنگی فاضل آپ کا تعارف ان سائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بیسویں صدی عیسوی کے ثلث کے خاتمہ پر یوں کرتا ہے :-

”ابراہیم کی ہستی کسی یہودی سردار کی نہ تھی، جو لوٹ مار کرتے یا ملک گیری

کرتے رہتے۔ ان کی اصل اہمیت مذہب کے دائرہ میں ہے۔ وہ حقیقتاً مورتی

کسی نسل کے نہیں بلکہ بانی و امام مذہبی تحریک کے تھے۔ محمد کی طرح جو ان کے

دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے۔ وہ ساری قوموں اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت

اور قوریت کے حسب روایت اسرائیلی مذہب کے بانی تھے“ (طبع چہارم، جلد اول صفحہ ۷)

جن لفظوں کو میں نے اس مجلس میں زور دے کر پڑھا ہے، انھیں ایک بار پھر سن لیجئے :-

محمد کی طرح وہ بھی قوموں اور قبیلوں کے رہنما تھے۔ ”اللہ کے خلیل اور اللہ کے حبیب کے درمیان یہ مماثلت کا اعتراف، یورپ کی زبان سے بے لوث شہرہ کی شان ہے !

ابراہیم خلیل باوجود مرتبہ خلقت، بہر حال انسانی دل و جگر اور بشری جذبات رکھتے

تھے، یہ مژدہ عظیم پا، باغ باغ ہو گئے، اور فرط مسرت سے وہ جھٹ سے بول اٹھے

وَمِنْ ذُرِّيَّتِي؟ اور میری نسل بھی اس امامت میں حصہ دار ہوگی نہ؟ ذریت کے

معنی اولاد ہی نہیں، بلکہ اولاد و اولاد بھی۔ گویا اس میں آپ کا سارا سلسلہ نسل آگیا، شاخ

اسرائیلی، شاخ اسماعیلی دونوں کو شامل۔ اور قرآن نے اسرائیلیوں کے اس دعویٰ کی جڑ ہی

کاٹ دی کہ ابراہیم سے جو دعوے ہوئے، وہ انھیں کی شاخ اسرائیلی کے ساتھ مخصوص

محدود تھے !

ضمناً روشنی اس پر بھی پڑ گئی کہ وعدہ انعام و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کر لینے کی
تفانی صورت امرِ جمعی ہے، بلکہ سنتِ انبیاء بھی!

بہر حال آپ کی دعا کا جواب، قرآن کے مبلغِ ایجاز میں یہ ملا کہ:

لَا يَتَّالِ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝ (آیت ۱۲۳) "میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا"

یعنی فصل و برکت کا سلسلہ تمہاری نسل میں ضرور جاری رہے گا، لیکن اس کے تحقق کے لئے
محض ارثِ نسل و نسب کافی نہیں بلکہ ایمان اور عملِ صالح بھی ضروری ہیں۔

الظَّالِمِينَ کے لفظ کا خوب خیال رکھیے، کافر تو اس میں کھلے ہوئے داخل ہیں
لیکن اہل علم کے ایک گروہ نے اس سے مراد فاسق بھی لئے ہیں۔ اور رشدِ تھانویؒ نے اس
سے یہ استنباط تو بہت ہی خوب کیا ہے کہ "اختیاری بد علی کے ساتھ فصلِ خداوندی اور انعامِ الہی
جسمِ جمع نہیں ہو سکتے۔"

یہ تاثر بھی عجیب ہے کہ بابل کی تاریخی غلطیوں کی کثرت سے اکتا کر بعض روشن خیال
فرنگیوں نے انیسویں صدی کے آخر میں حضرت ابراہیمؑ کی تاریخی حثیت ہی سے انکار کر دیا اور یہ
کہنے لگے کہ یہ شخصی نام نہیں بلکہ اکم جنس تھا، یعنی شیخ قبیلہ کا لقب لیکن کچھ ہی دن بعد پھر
تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کا ٹلٹ اول ہی ختم ہو رہا تھا کہ ایک بار پھر ابراہیم خلیلؑ
کی تاریخی حثیت تسلیم ہو گئی

————— بینا ۱۲ —————

آیت ۱۱۵، ابھی کچھ ہی دیر پہلے گزر چکی ہے، لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔
اب تحویلِ قبلہ کا حکم جب صراحت سے نازل ہونے کو ہے، تو پھر اس طرح کی چیمگوئیاں
اہل کتاب، خصوصاً یہودیوں میں شروع ہوئیں، حالانکہ اب تک جو نماز کا قبلہ بیت المقدس بنا ہوا
تھا یہ مبنی کسی قرآنی حکم پر نہ تھا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ

اپنا بھی محض اجتہاد بنالیا تھا، اور اب قیام مکہ ختم ہونے اور حجتہ مدینہ اختیار کرنے پر،
کچھ زمانہ کے بعد قبلہ نص قرآنی سے مقرر ہونے کو تھا کہ اس پر قبل و قال شروع ہو گئی اور قرآن کے
بیان سے معلوم ہوا کہ زبانیں کس طرح چلنا شروع ہوئیں :-

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّيْتُمْ عَنْ قِبَلَتِهِمُ الْبَقِيَّةُ
كَانُوا عَلٰیهَا قُلُوبٌ يَّالِيَةِ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ يَهْدِي
مَنْ يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (رکوع ۱۱، آیت ۱۴۲)

یہ بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے ان (مسلمانوں) کو ان کے اس
قبلہ سے ہٹا دیا ہے جس پر وہ اب تک تھے۔ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب
دونوں اللہ ہی کی ملک میں اور وہ جسے چاہتا ہے چلاتا ہے سیدھی راہ پر۔

کٹھ مچھتے اور نا فہم لوگ پھر وہی تفسیر سمت کا نکال رہے ہیں، اور بحث مشرق اور مغرب
کی شروع کر رہے ہیں۔ حالانکہ کسی سمت سے اودھنے پڑانے قبلہ سے کیا ہوتا ہے حکیم مطلق
جن مصلحتوں اور حکمتوں سے بھی چاہے جس مکان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے
وہی سیدھی راہ کا اتباع ہوگا، اس کے کام میں چون و چرا تو وہی لوگ کریں گے جو سفید ہو گئے
جو عقل کے کور سے، فہم کے ناقص۔ انہوں نے کہ مفسرین خود سمت و جہت کی بحث میں پڑ گئے
قرآن نے اصل اعتراض ہی پر تو اعتراض کیا تھا اور اس پر بحث ہی کو سر سے باطل ٹھہرایا تھا۔

— پیڑ ۱۳ —

اور معاً بعد جو حکم نماز کے وقت رخ کرنے کا ملتا ہے وہ کسی جہت یا سمت کی
جانب نہیں بلکہ ایک مخصوص مکان اور متعین عمارت کی بابت ملتا ہے۔

قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (آیت ۱۴۳)

آپ اپنا منہ پھیر لیا کیجئے مسجد حرام کی طرف۔

اور معلوم و معروف ہے کہ مسجد الحرام نام ہے مسجد حرم شریف یا خانہ کعبہ والی مسجد ایک معروف متعین عمارت کا۔ اور قرآن نے یہ حکم صادر کر کے یہ بھی بتا دیا کہ یٰسُکْرٰی اہل کتاب اس حکم تحویل قبلہ کی طرف سے کسی اشتباہ و مغالطہ میں نہ رہیں اور انھیں بتا دیا گیا تھا کہ قبلہ اب یہی اس امت کا بھی قبلہ ہو گا۔

وَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لِيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (آیت ۱۲۳)
 ”اور یہ لوگ کتاب پاپکے ہیں وہ یقیناً اسے بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ حکم بھی ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے۔“

اور یہ لوگ ایک اسی حکم کو کیا، ہمارے ان رسول کو بھی خوب ہی پہچانتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے خود اپنی قوم والوں کو خوب پہچانتے ہیں۔

الَّذِينَ اتَّبَعَتْهُمْ إِلَى الْقُدُسِ لِيَعْرِفُوهُمْ (آیت ۱۲۴)
 ”اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے وہ ان کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے نسل والوں کو۔“

یَعْرِفُونَ میں ضمیر لا سے کیا مراد ہے؟ اگرچہ اگلوں میں اکثر نے اس سے مراد ہی حکم تحویل قبلہ لیا ہے یعنی اہل کتاب مسجد حرام کو بھی بحیثیت قبلہ الانبیاء کے خوب جانتے ہیں، لیکن بعد کو اکثر اہل تفسیر کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ اشارہ ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے اور آنحضرت کی اتنی علامتیں ان کے ہاں منقول ہیں کہ اب انھیں اس بارے میں کوئی اشتباہ نہیں رہ سکتا، اہم ترین لفظ آیت میں أَبْنَاءَهُمْ لفظی معنی اپنے لڑکوں کے ہیں لیکن أَبْنَاءَهُمْ صیغہ جمع سے مراد فردا فردا نہیں، بلکہ قوم اسرائیل، نسل اسرائیل ہے اور یہ لوگ آپ کو بھی اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے کہ اسرائیلی پیروں کو۔

نعتب کو کام میں لائیں تو بات دوسری ہے

— سنچ ۱۲ —

دریان کی بہت سی آیتوں کو طے کرتی ہوئی، آخری نظر اس آیت پر جا کر رکھتی ہے،
بلکہ رُک جاتی ہے۔ پوری آیت ذرا بڑی ہے۔ عرض مقصود کے لئے نصف آیت بالکل
کافی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى
حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ (آیت ۱۷۷)

”طاعت یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر دو بلکہ طاعت یہ ہے
کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب
(آئی) اور پیغمبروں پر اور اس کی محبت میں مال تقسیم کرے قرابت داروں
اور یتیموں پر اور سائلوں پر اور راہ گیروں پر۔“

آیت قرآن مجید کی مشکل ترین آیتوں میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اصلاً بیان
صرف دو چیزوں کا ہے، ایک اس کا کہ پر یا طاعت یا نیکی کیا نہیں، اور ایک اس کا کہ پر
یا طاعت یا نیکی کیا ہے۔ اس دہرے سوال کا جواب بہت لمبا ہے۔ فلاں فلاں عقیدے
اور فلاں اعمال طاعت کے ضروری اجزاء ہیں۔ طاعت کے جو ضروری اجزاء ہیں ان میں
اختلاف کسی کو نہیں۔ اللہ، قیامت، انبیاء وغیرہ پر اعتقاد ہونا چاہیے۔ مالی امداد غریبوں،
یتیموں، فقروں وغیرہ سب کی کرنا چاہیے۔ گفتگو صرف اس میں رہ جاتی ہے کہ قرآن نے
یہاں طاعت کے دائرہ سے باہر کس عمل کو رکھا ہے؟ یہاں کس عمل کا نام لے کر قرآن نے
اس کے طاعت ہونے سے سرے سے انکار کیا ہے؟ وہ ہے مشرق یا مغرب کی

طرف رخ کرنا۔ اور مشرق رُخ یا مغرب رُخ کسی قسم کی بھی طاعت یا عبادت نہیں۔ اس استقبال قبلہ میں بھی چونکہ کسی نہ کسی طرف رخ کرنا ہی پڑتا ہے، اس لیے مفسرین کو ابھین یہ پیش آگئی ہے کہ اس سے تو استقبال کا حکم ہی رد ہوا جاتا ہے۔ حالانکہ آیت کے بیت الکعبہ کی طرف رخ کرنے کی ممانعت کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نماز میں تو رخ ایک متعین و معروف مکان۔ بیت الکعبہ کی طرف رہے، اور اب وہ مکان دنیا کے کسی خطے کے جس سمت میں بھی اور جس رخ پر بھی پڑ جائے۔ حکم میں سمت کی تو صریح سے تعین ہی نہیں۔ نہ جنوب کی، نہ شمال کی، نہ مشرق کی، نہ مغرب کی۔ اب اتفاق سے چونکہ وہ عمارت نمازی کے کسی نہ کسی سمت میں لا محالہ پڑے گی، اس لئے سمت کا تصور خود اس حکم کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور اس نے قلب مومن میں ابھین پیدا کر دی۔ اصل میں حکم کی زد مشرک قوتوں پر پڑنی ہے جن کے ہاں شرک کی بیسیوں قسموں، آفتاب پرستی، ستارہ پرستی، بت پرستی وغیرہ کے ساتھ ایک خاص قسم مہمت پرستی کی تھی، اور کچھ مشرک قومیں طلوع آفتاب کی بنا پر مقدس سمت مشرق کو سمجھنے لگیں تھیں۔ اور کچھ قومیں غروب آفتاب کی مناسبت سے سمت مغرب کو! قرآن کو یہاں مخالفت و ممانعت محض اس جہت پرستی یا سمت پرستی کی کرنا تھی! آیت اس خطبہ میں اصلاً صرف اس کے پہلے ٹکڑے لَیْسَ الْبِرُّ اَنْ تُوَلُّواْ وَجْهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کی خاطر پیش کی گئی، لیکن ضمناً یہ بات بھی شن لینے کی ہے کہ آیت قرآن کی اہم ترین و محکم ترین آیتوں میں سے ہے۔ اور حدیث ہی میں تو یہ صراحت اور بشارت موجود ہے کہ

من عمل بهذه الآية فقد استكمل۔

جس نے اس آیت پڑھ لی اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔

اور مفسر قطبی نے لکھا ہے:-

وقال علماءنا هذه الآية عظيمة من أمتهات احكام القرآن
بما رآه علماءنا من ان هذه آية عظيمة من احكام القرآن کی کبیدی آیتوں میں سے ہے

اور آگے اس سے سولہ مسئلے عقائد و طاعات کے نکال کر گناہے ہیں۔ صوفیہ محققین نے بھی آیت کو شریعت و طریقت کا جامع بتایا ہے اور ایک پُر لطف بات یہ بھی ہے کہ پادری ویری (WHERRY) صاحب جنہوں نے یہاں کے انگریزی ترجمہ قرآن کو زمین بنا کر اس پر چار جلدیں اپنی تفسیر کی لکھ ڈالی ہیں، ان کے قلم سے قدرت یہ عبارت لکھواتی ہے ”یہ آیت قرآن کی بلند ترین آیتوں میں سے ہے۔۔۔۔۔ ذات باری پر ایمان“
 نوع انسان کے ساتھ سلوک، اس کو اس میں واضح طور پر مذہب کا جوہر اُٹھائی بتایا ہے
 اس میں لب لباب عقائد اور اعمال کا آگیا ہے۔

غنیمت اور بہت غنیمت ہے کہ پادری صاحب موصوف کو قرآن مجید میں کچھ آیتیں تو بہت بلند قسم کی نظر آگئیں۔

بخیر ۱۵:

اس کے معاً بعد حکم قصاص کا شروع ہو جاتا ہے اور آیت قصاص کی آجاتی ہے:
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (آیت ۱۷۸)
 ”اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔“

اس میں سرسری طور پر پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اس حکم کے مخاطب کلمہ گو امت کے افراد نہیں کہ جس کسی کو کسی سے کوئی شکایت پیدا ہوتی، بس اُس نے اس کی مار کاٹ اندھا دھند شروع کر دی۔ حکم امت کے اہل حل و عقد کو مل رہا ہے۔ حکم انھیں مل رہا ہے جو ایک اجتماعی وجود اور طاقت رکھتے ہیں اور اپنی حکومت کے قانون پر نفاذ کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح سمجھنے کا دوسرا لفظ قصاص ہے ”قصاص“ انتقام محض کے مرادف نہیں بلکہ قانون نو جداری کے تحت انتقام کی ایک منظم و مہذب شکل کا نام ہے، اور امت کا ایک قانونی و اجتماعی حق ہے۔ اس کے نفاذ کی ذمہ داری عدالت پر عائد ہوتی ہے۔

اسلامی قصاص کا جزو اہم یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ملحوظ رہے گی اور خون خون

سب کا برابر رہے گا۔ یہ نہیں کہ اپنے شخص کی جان کی قیمت معمولی شخص کی جان سے زیادہ سمجھی جائے۔ ایک مقتول کے قصاص میں دوسری قوم یا پورے قبیلہ کو تباہ کر دیا جائے۔ عرب جاہلی میں ایک دستور یہ بھی پڑ گیا تھا کہ آزادوں میں سے کوئی اگر کسی غلام کو مار ڈالتا تو قصاص میں جان اس آزاد کی لینے کے بجائے کسی غلام کی لی جاتی اور جاہلی عرب کا ایک دستور یہ بھی ہو گیا تھا کہ اگر قاتل کسی ادنیٰ قبیلہ کا شخص ہوتا تو کسی اعلیٰ قبیلہ کے ایک مقتول کے عوض قصاص اس ادنیٰ قبیلہ کے دو شخصوں سے لیا جاتا۔ اور دنیا کی تاریخ آج بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ امریکہ میں آج بھی ایک گورے (WHITE) کا خون ایک کالے (NEGRO) کے خون سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اور فرنگی حکومتیں، ابھی چند ہی سال کی بات ہے کہ اپنے ایک مقتول کے عوض کالی قوم والے قاتل کے متعدد ہم قوموں کی جانیں لئے بغیر تسکین حاصل نہیں کرتی تھیں۔

یہاں پہنچ کر فقہائے مفسرین کے اس نکتہ سنجی کی داد دیجئے کہ انھوں نے قصاص کی تفسیر میں صاف لکھ دیا ہے کہ:-

ای المساواة بينهما لا الزيادة -

قصاص سے مراد یہ ہے کہ بس اتنا ہی لیا جائے گا زیادہ نہیں۔

اور نسفی صاحب ہدایہ التشریح کے الفاظ میں:

القصاص عبارة من المساوات والمعنى فرض عليكم

اعتبار المماثلة والمساواة من القتل

قصاص سے مراد مساوات ہے، اور مطلب کہنے کا یہ ہے کہ قتل کے بارے

مماثلت و مساوات ہی کو دیکھا جائے گا۔

————— پنچ ۱۶ —————

قل و قصاص کے سلسلہ میں ایک نیا لفظ قرآن کی زبان سے دیت کا سن لیجئے

یا اردو میں خون بہا۔

نیا اس سنی میں کہ دنیا کے اکثر مہذب قانونوں میں اس کا مراد نہ ملے گا، وہیوں
کے قانون میں قتل ایک فوجداری کا جرم تھا، دیوانی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور فرنگی قانون
چونکہ اسی رومی قانون کا نقش ثانی ہے اس میں بھی جرم قتل صرف فوجداری کا جرم ہے لیکن
اسلام چونکہ عین دین فطرت ہے۔ اس نے قتل کو ایک حد تک دیوانی کا جرم بھی تسلیم کیا ہے،
اور اس نے حقیقت سامنے رکھی ہے کہ قتل جس طرح ایسٹ یا حکومت اور سوسائٹی یا معاشرہ
کے ایک قانون کی خلاف ورزی ہے، اُسی طرح یہ بھرپور خطہ اس کی شخصی حیثیت پر بھی ہے
گویا یہ جرم دو گونہ حیثیت رکھتا ہے۔ ایک پبلک یا عمومی۔ دوسرے نجی یا انفرادی، اسی لئے
مقتول کے وارثوں یا خون کے مدعیوں کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ چاہیں تو قاتل کو کوئی سزا حکومت
سے ولایں۔ اور اگر چاہیں تو خود مالی معاوضہ لے کر انتہائی سزا سے دست بردار ہو جائیں میں
اسی کو اصطلاح شریعت میں دیت کہتے ہیں۔

DAMAGES کا انگریزی لفظ آپ نے سنا ہوگا۔ جب کسی ملک کی رعایا کا

خون دوسرے ملک میں ہو جاتا ہے اور اجنبی ملک میں فوجداری کا مقدمہ چلانے میں دشواریاں
اور جہتیں محسوس ہوتی ہیں، تو جائز ہے کہ بجائے فوجداری استغاثہ اور اس کی پیروی کے
صرف ہرجانہ کی مالی رسم پر کفایت کر لی جائے Damages اسی ہرجانہ کو کہتے
ہیں اور ایک حد تک میشل خون بہا کے ہے Damages کا لفظ آپ نے
صاحب کی زبان سے سنا ہے، آپ کو مانوس معلوم ہوتا ہے، دیت یا خون بہا
آپ صرف مولوں ملاؤں کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، اس لئے قدرتا آپ کو نامانوس
معلوم ہوتا ہے۔

————— ❦ —————

آگے قاتل و مقتول دونوں کے فریقوں کو خوب تاکید ہے، عدل و رفع شر اور علم

اور زیادتی سے بچنے کی۔ ایک فریق پر اس کی کہ وہ خوں بہا کا مطالبہ معقولیت کے حدود
کے اندر رہ کر کرے، آدمیت سے کرے، غصہ اور اشتعال سے بات کو تنگ نہ بنائے
اور معاملہ کو اور آگے نہ بڑھائے اور دوسری طرف قاتل کے یا ملزموں کے فریق کے دل میں
یہ بات اُٹھاری ہے کہ جتنی رقم کی قرار داد ہو چکی ہے، اسے بغیر کسی طوالت یا پیچیدگی اور مزگی
کے خوش اسلوبی کے ساتھ پہنچا دیں۔ اور دونوں فریق اُمت یا معاشرہ کو فسادِ مزید سے ہر طرح
بچائے رکھیں۔ اور مضمون کو ختم ان دو آیتوں پر کیا ہے:

ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۖ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ
ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوَةٌ
يَاۤأَيُّهَا الَّذِيْنَ اَلْبَابُ لَعَنَكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (آیات ۱۷۸ - ۱۷۹)

”یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور ہربانی ہے جو کوئی اس کے
بعد بھی زیادتی کرے گا تو اس کے لئے عذاب دردناک ہے اور تمہارے لئے
(قانون) قصاص میں زندگی ہے، تاکہ تم پر ہیزگار بن جاؤ۔“

انہی نفسیاتی نزاکتوں کا پاس رکھنا، اور ہر فریق کو نفسانیت کے اثر سے بچائے
رکھنا، یہ شانِ صرفِ خدائی ہی قانون کی ہو سکتی ہے، اور اسی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ
ایک طرف قصاص کی بظاہر سختی، اور دوسری طرف دینیت و عفو کی نرمی، یہ حسنِ امتزاج اور
اعتدال۔ توازن کا مکمل قوام وہی قانون ہو سکتا ہے جو بشری دماغ سے نہیں بلکہ حکمت
مطلق سے نکلا ہے۔ اور جو لوگ اس قسم کی زیادتیوں پر آمادہ رہتے ہوں
کہ کسی پر جھوٹا دعویٰ قتل کا دائرہ کر دیا، یا کسی قاتل کو پہلے تو بالکل معاف کر دیا اور پھر معافی
کے بعد درپے پورے قصاص کے ہو گئے۔ ایسے بے انصافوں اور خدا نافرمانوں کو
روکنے والا عذاب الیم یا خوفِ آخرت ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ ساری
ہدایتیں، ترغیبات ہیں ہی اسی لئے کہ سارا معاشرہ پرہیزگاروں، منصف مزاجوں

عدل شعاروں کی قوم بن جائے، بلکہ امت کا مزاج ہی عدل و تقویٰ پر قائم ہو جائے۔

سسہ: سیر (۱۸) سیر: سسہ

روزمرہ کے احکام قرآن میں متفرق و متعدد مقامات میں نہیں ملتے۔ جو بھی حکم ملا ہے، مختصر جامعیت کے ساتھ ایک ہی مقام سے اور سن رکھنے کے قابل ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ (آیت ۱۸۱-۱۸۲)

”اے مسلمانو تمہارے اوپر روزہ فرض کیا گیا ہے، جیسا کہ تم سے پیشتر سے لوگوں پر فرض ہو چکا ہے، یہ روزے گنتی کے چند روز ہیں۔“

روزے کے حکم سے طبعی وحشت دور کرنے کے لئے پہلے تو یہی فرمایا گیا ہے، کہ یہ تمہارے لئے کوئی نیا حکم، کوئی نئی سختی نہیں، یہ حکم تو پہلی قوموں کو بھی مل چکا ہے۔ لیکن یہ مثلیت صرف فرضیت کے لحاظ سے ہے، تعداد و زمانہ، مقصد و غایت وغیرہ کے لحاظ سے نہیں۔ روزے قمری حسری کے نویں مہینہ میں ہوتے ہیں جسے ماہ رمضان کہا جاتا ہے اور ہر ہلالی مہینہ کی طرح یہ مہینہ بھی گھوم پھر کر سال کے ہر موسم میں آتا رہتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں روزہ نام ہے طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور عمل زوجیت کیے نہ رہنے کا۔ اور حدیث میں سخت تاکید غیبت، فحش، جھوٹ، بدزبانی، دل آزاری وغیرہ ہر قسم کے گناہ سے بچنے کی آئی ہے۔ دنیا کی جلتیں اس پر متفق ہیں کہ روزہ جسمانی بیماریوں کو دور کرنے والا اور علاج جسمانی کا ایک بہترین نسخہ ہے اور صلیب نفس و تزکیہ روح میں جو اس سے مدد ملتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ پھر اس سے سہا سہا نہ برداشت اور ضبط نفس کی تربیت جو تازہ ہو جاتی ہے اس کے لحاظ سے بھی مہینہ بھر کی یہ سالانہ مشق ایک بہترین پروگرام ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، ایک عجیب جامعیت کا دو لفظی تھا سا فقرہ ہے جس کے اندر ساری ظاہری اور باطنی، اور انفرادی اور اجتماعی فضیلتیں آگئیں۔ گویا مقصود صرف حصول تقویٰ ہے۔ تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر عادتوں سے محتاط رہنے سے جسمانی صحت درست ہو جاتی ہے، بھوک کھل جاتی ہے، خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے، مادی لذتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح اس عالم آب و گل میں تقویٰ اختیار کئے رہنے سے آخرت کی نعمتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت انسان میں پوری طرح پیدا ہو کر رہتی ہے۔

اور معاً بعد ہے آیاتاً مَعْدُودَاتٍ، کم ہمتوں کی ڈھارس بندھانے کو یہ کہ کوئی بڑا طویل زمانہ اس کے لئے نہیں۔ دو تین ہفتہ کی مسلسل مدت بھی اس کے لئے ضروری نہیں۔ کل ایک ہفتہ کی مدت۔ اور پھر اس میں بھی بکثرت رعایتیں۔ وقتی طور پر بیمار مستثنیٰ، مسافر مستثنیٰ، دیرینہ سال مستثنیٰ، اور ان میں سے کوئی معذور یا مستقل تو استثناء بھی مستقل۔ وحدت امت کی حکمت کے لحاظ سے لازمی تھا کہ زمانہ ایک ہی متعین ہو۔ چنانچہ زمانہ متعین اور دو سکے شرائط بھی متعین۔

اور ایک بڑی رعایت فدیہ دینے کی ہے۔ عَلَى الَّذِينَ يُطِيفُونَہ کے ماتحت۔ اطاعت کی پوری بحث یہاں دہرائیے تو خاصی طوالت کی نوبت آجائے۔ مختصر یہ کہ عربی ہیں وسعت اور طاقت دونوں کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ وسعت کے معنی تو گنجائش و امکان کے ہیں۔ کسی کام کو بہ سہولت انجام دے دینے کے ہیں۔ اور طاقت یہ ہے کہ کوئی کام کرنے کو کر ڈالے لیکن مشقت کے بعد، یا جان ہلکان کر کے ہی کر سکے۔ جن حضرات کو ذرا تفصیل سے اس بحث کے دیکھنے کا شوق ہو، وہ خاکسار کی تفسیر میں اس مقام کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس سلسلہ کی آیتوں میں خصوصی اہمیت رکھنے والے الفاظ یہ ہیں:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (آیت ۱۸۸)

”سو تم میں سے جو کوئی اس ہفتہ کو پاسے تو چاہیے کہ وہ ہفتہ بھر روزے رکھے“

اہم ترین لفظ ”شہود شہر“ کا ہے، یعنی ہینہ کے پالنے کا۔ یعنی فرضیت روزہ کی اس کے لئے ہے جو ماہ رمضان کا شہود کرے۔ اس ہینہ کو پائے لیکن اگر کوئی ملک ایسا ہو جہاں چاند شروع ہینہ میں طلوع ہی نہ ہوتا ہو وہاں فرضیت کا حکم ہی نہیں باقی رہے گا یہ اور بات ہے کہ وہاں بھی تاریخوں کا حساب کر کے رمضان ادا کر لے۔ جیسے ان ملکوں میں جہاں سورج طلوع ہی نہیں ہوتا، یا برائے نام طلوع ہوتا ہے، نماز بھی گھڑی سے حساب لگا کر کسی طرح پڑھ لی جائے گی۔ آیت کے اندر ایسے الفاظ لے آنا جس سے استدلال ایسے نادر الوجود ملکوں کے وجود پر ہو سکے، اعجاز قرآنی نہیں تو اور کیا ہے ؟

ابو بکر جصاص رازی، قدیم فقہائے حنفیہ میں مرتبہ امامت رکھتے ہیں اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں آیت میں مذکور و مندرج احکام کا ذکر کرتے ہیں، وہاں نمبر اول پر اسی شہود شہر کو بنیاد فرضیت قرار دیتے ہیں:-

فيه عدة احكام منها ايجاب الصيام على من شهد
لاعلى من لم يشهد-

”اس میں متعدد احکام ہیں، ان میں روزے کا وجوب ان کے لئے جنہوں نے ہینہ کو پایا، نہ کہ ان کے لئے جنہوں نے ہینہ کو نہیں پایا کتنے شبہات کا جواب اس ایک لفظ ”شہود شہر“ سے نکل آیا !

—: (۱۹) —:

بلاغت قرآنی کا ایک عام اسلوب یہ بھی ہے کہ جزئیات احکام بیان کرتے کرتے، بہ ظاہر محض سبیل تذکرہ یا اتفاقہ کوئی عام قاعدہ یا اصولی نکتہ بیان کر دیا جاتا ہے جس کے اندر کوئی گہرا مغز ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ صوم و صیام کے مسائل و احکام بیان کرتے کرتے بیچ میں یہ ٹکڑا بھی لے آتا ہے:

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ
وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ - (آیت ۱۸۵)

” (ان نام انتظامات سے) اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور
تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا۔

یعنی یہ ساری رعایتیں اور سہولتیں جو بیان ہوئیں اس سے مقصود اللہ کو بندہ کے
حق میں آسانیاں ہی فراہم کرنا ہے نہ کہ سختیاں اور دشواریاں۔ چنانچہ جو روزے قضا
ہو جائیں، ان کی تکمیل اگر کر لو تو روزوں کی ادائی کا اجر پورا مل جائے گا، اور گھانا کچھ
نہیں اٹھانا پڑے گا۔ اور ایک صوم و صیام پر کیا موقوف ہے۔ ہر حکم کی تہ میں
بندوں کے حق میں مصلحتیں اور رحمتیں ہی ملیں گی اور جہاں کوئی بھی دشواری یا معذوری
پیش آئی، بس اس کے مناسب و متناسب کوئی نہ کوئی رخصت یا رعایت بھی مل گئی۔
اور مسائل رمضان و متعلقات رمضان کا بھی تکرار ہی ہو رہا ہے کہ یہ آیت
نظر پڑ جاتی ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ
الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي
لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝ (آیت ۱۸۵)

(اور اسے سمجھو) ”آپ سے میرے بندے جب میرے باب میں سوال
کریں آپ کہہ دیجئے کہ میں نزدیک ہی ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب
دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے تو بندوں کو چاہیے کہ میرے احکام
قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت یاب ہوں۔“

بدنظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے متعلق سوال یہ ایک الگ سے بات کہاں سے
آگئی، لیکن ذرا غور کیجئے تو صاف سمجھ میں آجائے کہ روح میں جو جلا اس روزہ داری اور

شب بیداری سے پیدا ہوتی ہے، اُس کا عین تقاضا ہے کہ تعلق باللہ کی روح بیدار ہو اور طبیعت میں اللہ سے مانگنے، سوال کرنے اور اللہ کے آگے ہاتھ پھیلا دینے، گراگڑانے کی ہوا سر پر سوار ہو۔ رمضان میں اس تعلق کی طلب اور تڑپ پیدا ہونا تو عین مقتضائے حال کے مطابق ہے۔

پھر ایک اور باریکی ملاحظہ ہو۔ آیت میں خطاب براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ جناب باری سے تعلق کے لئے تو سطر رسول اللہ ہی کے ساتھ مخصوص رکھنا اور انہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف گمان نہ لے جانا۔ خدا کے ساتھ بندوں کا ربط و تعلق جو قدیم مذہبوں کے سامنے ایک سخت گتھی ہمیشہ رہا کی ہے اور اکثر مذہبوں نے تو خدا کو اتنا دور اور بندوں سے اتنا بعید فرض کر لیا ہے کہ اس تک رسائی گویا ممکن ہی نہیں۔ قرآن نے اس وہم کو دور کر دیا اور صاف صاف بتایا ہے کہ جسے تم دور سمجھ رہے ہو، وہ دور نہیں، نزدیک ہی ہے، اور اس سے تم ربط ہمیشہ ہی حاصل کر سکتے ہو۔ یہ قریب رہنا تو ہمیشہ ہی ہے اور رمضان میں اس عموم میں خصوص پیدا ہو جاتا ہے اور ربط خاص سے خاص تر ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچئے، بندوں کے لئے تسکین، راحت کا کتنا سامان اس آیت کے اندر رکھ دیا ہے۔

اپنے خدا کو ڈھونڈھنے کے لئے، اس سے راز و نیاز کرنے کے لئے کہیں اور نہیں جانا ہے، وہ تو ہم سے قریب ہی ہے۔

ایک نکتہ اس آیت کے ذیل میں اور ہے۔ اس ایک آیت کے اندر ضمیر متکلم کتنی بار عَنِّي میں، فَاِنِّي میں، اُجِيبُ میں، دَعَايَ میں، رَحْمَتِي میں صیغہ واحد میں آتی ہے۔ زبان کے نکتہ سنجوں اور بلاغت کے راز آشنائوں کا قول یہاں ہنچکر پھر یاد کر لیجئے کہ ضمیر متکلم جس طرح دلالت کرتی ہے قدرت، عظمت و قوت پر، اقتدار و حکومت پر، ضمیر واحد متکلم اسی طرح مخصوص ہے التفات، اختصاص اور یگانگت

کے لئے! ————— خوش نصیب بندے! تیرا پمردگار تجھ کو کتنا اپنے
قریب کھینچتا جا رہا ہے!

آیت کے الفاظ پر نظر ایک بار پھر ہو، اُجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ: پکارنے
والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، ہر پکار سننا ہوں، اس میں کوئی شبہ نہ ہو۔ اور پھر جن
دعاؤں کو قابل قبول سمجھتا ہوں انہیں قبول بھی کر لیتا ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے ہاں
ہر دعا سمجھا دھن قبول ہی ہو جاتی ہے۔ ہاں سُنْ ہر دعا لی جاتی ہے، معقول یا نامعقول
بندہ غریب کو کیا خبر کہ کون اس کے حق میں مفید ہوگی، کون مضر۔ قبول تو بس وہی
دعائیں ہوں گی جو رحمت و حکمت مطلقہ کے منافی نہ ہوں گی۔

وَلْيُؤْمِنُوا بِيٰ اور ایمان لائیں مجھ پر۔ ایمان محض میرے اور پر رکھیں،
ایمان اگر وہ سرے سے کہیں اور رکھتے تو دعا ہی مجھ سے وہ کیوں کرتے۔ نہیں، بلکہ
ایمان لائیں میرے صفات کاملہ پر، میرے حکم ہونے پر، میرے حاکم ہونے پر،
میرے قادر ہونے پر، اور میری رعایت بصریح پر

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝ تاکہ ان پر فوز و فلاح کی، ہدایت کی راہیں کھل
جائیں، تاکہ فلاح دارین کے دروازے ان پر کھل کر رہیں اور ایمان کامل اور عملِ حاکمِ الہی
کے بعد درجہ رشد تک پہنچ جانے میں ارباب بھی کیا ہو سکتا ہے؟

————— ۲۰ —————

جہاد و قتال کا ذکر تو قرآن مجید میں بار بار آیا ہے اور اس کے احکام قرآن کے
متفرق حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جگہ اس ضمن میں پارہ سب قول کے
نصف اول میں ہے:

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَىٰ

التَّهْلُكَةُ ۖ وَاحْسِنُوا فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

”خروج کرتے رہو اللہ کی راہ میں اور اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں

نہ ڈالو اور نیک کام کرتے رہو۔ بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

جس جنگ کا نام شریعت کی اصطلاح میں جہاد ہے، اور جسے قرآن میں قتال سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ مالک گیری کے لئے، سلطانی شان و شوکت کے لئے، عسکری فتح مندی اور نام آوری کے لئے جائز نہیں۔ اس کے لئے سب سے بڑی سب سے کڑی، سب سے پہلی قید لگی ہوئی ہے فی سبیل اللہ کی، اللہ کی راہ میں ہونے کی جان اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وہ نفس کی راہ میں گنہگارنے کے لئے نہیں۔ صرف دین کی خدمت میں پیش کر دینے کے لئے ہے۔ اور جان کے بعد ذکر مالی کا نعمت کی حیثیت آتا ہے۔ اس کے لئے بھی شرط وہی فی سبیل اللہ کی لگی ہوئی۔ قدر اس صرف مال کی نہیں جو ہوائے نفس کی راہ میں ہونا حق و باطل کے لئے ہو، لیکن اس حکم کے ساتھ یہ دوسرا حکم کیسا جڑا ہوا ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو یعنی یہ منع قتال کی تعلیم کیسی؟

جی نہیں، منع قتال کہاں؟ سیاق سے تو عین تائیدی اور تاکید حکم مل رہا ہے۔ کہ جہاد و قتال کا موقع آجانے پر مجاہدوں کی مالی ضرورتوں کی طرف سے غفلت ہرگز نہ برتی جائے، ان کی مالی اعانت میں بخل کر کے امت کو تباہی و ہلاکت میں ہرگز نہ ڈالو۔ دل کھول کر ان کی مدد کرتے رہو، اور اس موقع پر دست کشی کو بالکل تلی خود کشی کے مراد سمجھو: — اور آیت کا بقیہ حصہ اس کی تشریح و تقویت کے لئے ہے۔

التَّهْلُكَةُ کے یہی معنی صحابہ سے منقول ہیں۔ صحابیوں میں عبد اللہ ابن عباسؓ، ابو ایوب انصاریؓ اور حذیفہؓ نے لئے ہیں۔ اور یہی تابعین میں حسن، قتادہ، عکرمہ اور عطاء سے مروی ہیں

تو گویا آیت سے جو پہلو منع جہاد کا بے غوری کی بنا پر نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا، وہ

درحقیقت عین ترغیب و تاکید میں ہے۔ اور آخر آیت میں احسان اور محسنین میں اشارہ
جہاد اور مجاہدین ہی سے ہے۔ احسان یعنی حسنِ عمل ایسی مفہوم میں ہے۔

————— پیڑ ۲۱ —————

احکام جہاد و قتال کے بعد ہی مسائل حج مشروع ہو جاتے ہیں، اور اس سلسلہ میں
عازمان حج سے خطاب کر کے آیا ہے:

وَتَزَوَّدُوا (آیت ۱۹) زاد راہ لے لیا کرو
غیر مذہب والے عجیب نہیں کہ اس حکم کو حسیہ سے سنیں اور کہنے لگیں کہ یہ حج کا سفر تو
عین عبادتی سفر اور خدا کی راہ کا سفر ہے، اس کے ضمن میں یہ ظاہری سامان پر زور کیسا ہے
اس کے لئے تو تدبیر تمام تر اس پر چھوڑ دینا چاہیے جس کی خاطر سفر کیا جا رہا ہے۔ تیرتھ یا تڑا
کی شان تو یہی ہے۔ اس سفر میں تو ہر اقدام ماسوا سے علیحدگی کا ہونا چاہیے۔
جی نہیں۔ یہی تو بڑا فرق اسلام اور دوسرے مذہبوں کے درمیان ہے۔ قرآن کے
سامنے تو ان ناقص مذہبوں کے نوئے موجود تھے جن کے پیرو تیرتھ یا تڑا یا زیارت یا کٹر
و متعابر کے لئے نکلتے، تو مفلس تلاش ہو کر، ننگے اور بھوکے اور مانگتے کھاتے ہوئے اور
اپنا بار دوسروں پر ڈالتے ہوئے بد مذہب کے کھکشتو تو خصوصاً اس لت میں مبتلا تھے اور
عرب جاہلی کنگال بن کر زیارت کو قابلِ فخر سمجھتے، حدیث بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس
صحابی کی روایت ہے:

كان اهل اليمن يحجون ولا يتزودون ويقولون نحن
المتوكلون فاذا قدموا بمكة سألوا الناس
”یمن والے حج کرتے جاتے تو زاد راہ نہ لیتے بلکہ یہ کہتے رہتے کہ ہم تو
متوکل ہیں اور جب کہ پہنچتے تو لوگوں سے مانگتے رہتے۔“

اور تفسیر ابن جریر میں ہے :

كانوا يحبون بغير زاد كان بعضهم اذا احرم ري
ما معه من الزاد

”لوگ حج تو کرتے مگر بغیر زاد لئے ہوئے اور کوئی تو ایسا بھی ہوتا جو احرام

پہن لینے کے بعد زاد کو پھینک دیتا۔“

اور تفسیر طبری میں ہے :

من العرب كانت تجئ الى الحج بلا زاد ويقول بعضهم

كيف نخرج بيت الله ولا يطعمنا

عربوں میں سے بعض حج کو آتے بلا کسی خوشہ راہ کے اور بعض اسی مما سے کہتے ہم

اللہ کے گھر کا حج کس طرح کریں تاکہ وہ ہمیں نہ کھلائے۔

تو قرآن کو اس جھوٹے توکل، اس نمائشی روحانیت سے روکنا اور ہر ناجی و زائر میں شخصی

غیرت و خودداری پیدا کرنا تھا اور دوسری طرف اجتماعی معاشیات کو ایک خواہ مخواہ کے

بار سے روکنا تھا اور ایک تمام غلط رسم و رواج سے نجات دلانا۔ اس لئے تاکیداً

ارشاد ہوا ہے۔

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي

الْأَلْبَابِ ۝ (آیت ۱۹۷)

”اور زاد راہ لے لیا کرو، اور بہترین زاد راہ تو تقوا ہے۔ سو میرا ہی

تقویٰ اختیار کئے رہو، اسے اہل انفس۔

اور جس تقویٰ کو یہاں تاکید اور تکرار کے ساتھ کہا گیا ہے، اس کی ایک بڑی شرط ہے گداگری

سے احتراز اور دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنے سے احتیاط، اور اپنا بار دوسروں

ڈالنے سے اجتناب۔ قرآن کے بہترین ترجمانوں نے اس سیاق میں تقویٰ سے

مراد یہی لی ہے۔ کثافت میں ہے:

ای اتقوا الاستطعام و ابرام الناس والاشتغال علیہم
”یعنی بچو لوگوں سے کھانا مانگنے سے، لوگوں سے لگے پٹنے سے، اور ان پر
بارِ خاطر بننے سے۔“

اور مدارک میں ہے:-

الاتقاء عن الابرام والتشغل علیہم۔

”بچنا ہے لوگوں کے لگے پٹنے اور ان پر بارِ خاطر ہونے سے“

اہمیت کے خاتمہ پر مخاطب اولوالالباب یا اہل فہم سے خاص طور پر مرعنی ہے
یعنی غور و فکر خود ہی تمہیں نتیجہ تک پہنچا دے گا۔ اور فہم و تدبیر والے دل سے ایسی
پر حکمت ہدایات کی قدر کریں گے۔ نتیجہ میں انفرادی، اجتماعی، روحانی، اخلاقی و معاشری
سامانے ہی پہلو فوز و صلاح کے آجاتے ہیں

————— ﴿۲۲﴾ —————

اور یہ جو ابھی عرض ہوا ہے کہ روحانی و اخلاقی کے ساتھ مادی فوز و صلاح بھی حاصل
ہو گا تو اسے انکار کے کاؤں سے نہ سنبھلیے، اور اسے سن کر اچھے میں نہ پڑیئے، معافی
تذریل مبارک ہی میں صراحت کے ساتھ ارشاد ہوا جاتا ہے

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ (آیت ۱۹)

اور کوئی مضائقہ نہیں اس باب میں کہ تم اپنے پروردگار کے پاس کمال تلاش معاش کرو
فَضْلًا سے کھلی ہوئی مراد مالی تجارتی منفعت ہے۔ اس مفہوم پر ابن عباس صحابی
سے لے کر تابعین تک متحد ہیں، اور یہاں بھی قرآن دوسرے مذہبوں کا خشک غلو توڑ رہا ہے
اور رہبانیت کے تصور پر ضرب لگا رہا ہے۔

اہل جاہلیت کی خشکی کیسے یاد ہم پرستی، اس باب میں اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ
 حج کے موقع پر جو تاجر مال تجارت لے کر منیٰ و مکہ کے بازاروں میں اترتے تھے، بلکہ
 جو اونٹ والے اپنے اونٹ مکہ، عرفات، منیٰ، مزدلفہ کو لے جاتے تھے، سمجھا جاتا تھا
 کہ ان لوگوں کا حج ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہاں تجارت آگئی، عبادت کا وجود ہی کہاں
 باقی رہ گیا؟ قرآن مجید اپنے حکیمانہ اسلوب بیان کے ساتھ قدم قدم پر ان ساری غلط فہمیوں
 اور غلط غیرت مندوں کے پردے چاک کرتا جاتا ہے، اور حقانیت کے چہرے سے نقاب
 اٹھاتا جاتا ہے۔

دوسرا خطبہ

— (۲۳) —

عورت مرد کے باہمی تعلق اور تفاعل کا مسئلہ ہمیشہ سے بڑے معرکہ کا چلا آرہا ہے۔ پُرانے فلسفہ اور پُرانے تمدن نے مرد کو آسمان پر چڑھا اور عورت کو زیرِ زمین اتار دیا تھا اور فرنگستان جدید میں بھی خال خال کوئی نفسی، مفکر اور سوشیالوجسٹ اس آخری خیال کے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً جرمنی میں شوپنہاؤر *Schopenhauer* برطانیہ میں کیپٹن لڈوسی اور میڈم شارلیپ *Madam Sharlip* اور ایران ہو کہ ہندوستان سب کہیں کہاوتیں، مثلیں وغیرہ اسی مفہوم کی چلی آرہی ہیں۔ لیکن جدید فرنگستان نے اسی کے ردِ عمل کے طور پر نظریہ بالکل ہی دوسرا رکھا ہے۔ یہاں عورت سر پر چڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اور قریب ہے کہ صنفِ نازک کی افضلیت اور اولیت کا اعلان بطور ایک مسئلہ کے ہو جائے۔ اب قرآن نے دیکھیے کیا محتاط اور متوازن فیصلہ صادر کیا ہے۔

اصل اصولی اور بنیادی فارمولا اس نے یہ بتایا ہے اور وہ بھی کس ایجاز کے ساتھ۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (آیت ۲۲۸)

اور عورتوں کا بھی ویسا ہی حق ہے جیسا کہ ان کے اوپر ہے موافق دستورِ عربیہ کے

سلیبس و عام فہم اردو میں اسے یوں کہئے کہ جس طرح مردوں کے حق عورتوں کے ہیں اسی طرح عورتوں کے حق مرد پر ہیں۔ اور یہ نہ سمجھو کہ شوہروں کے حق میں فرائض

بس یہودیوں کے ذمہ عائد ہوتے ہیں بلکہ ایسے ہی خرافات یودیوں کے حق میں شہرہوں کے ذمہ بھی عائد ہوتے ہیں اور یہ اصل اصول کی منادی چھٹی صدی کے ایک اُمتی عرب کی زبان سے اُس وقت کرائی گئی، جب دنیا میں یہودیت، نصرانیت، ہندویت، مجوسیت، غرض بھی مذہبوں کی زبان سے کہلایا یہ جارہا تھا کہ ”شہر یہودی کا آکا و مالک ہے، اور یہودی اس کی ملوکہ“

”عورت جہنم کا دروازہ ہے اور ہر بشر میں شر کا باعث اسے حقیر

و ذلیل سمجھنے کے لئے ایس ہی کافی ہے کہ وہ عورت ہے۔“

ان دو عبارتوں میں یہودیت اور نصرانیت کی تعلیمات کا خلاصہ آگیا اور ایسا ہی کچھ حال چین کے حکیم کنفوشس اور ہندو مت کے منوبھی اور بدھ مت اور مجوسیت وغیرہ کے صحیفوں کا نظر آتا ہے۔ ان سب کے اقتباسات اگر نقل ہوں تو یہ خطبات اپنے اہل موضوع سے دور ہی جا پڑیں۔

اور جب قرآن نے عورت کی یہ صلا مساویانہ پوزیشن مضبوط کر لی، تو اپنی حقیقت پسندی اور حقیقت شناسی کی بنا پر اس اہم تکرار اور ضروری ضمیمہ کا بھی اعلان کر دیا، کہ

وَالرِّجَالُ عَلَىٰ نَاصِيَةٍ (آیت ۲۲۸)

اور مردوں کو ان کے اوپر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔

قرآن جس طرح جاہلیت قدیم کے اس دعویٰ کو مسترد کر رہا ہے کہ عورت حقیر و ذلیل ہے۔ اسی طرح جاہلیت جدید کے بھی اس قول بے دلیل کے ماننے سے انکار کر رہا ہے کہ مرد و عورت ہر حیثیت سے مساوی اور ہر اعتبار سے ہم درجہ ہیں۔ مساوات کامل اور مساوات مطلق دونوں ضمیموں کے درمیان نہیں بلکہ مرد کو عورت پر من وجہ یا ایک گونہ ترجیح اور فوقیت حاصل ہے۔ قرآنی لفظ دَرَجَةٌ خوب خیال میں رہے۔ مرد عورت کا مالک نہیں۔ عورت اس کی کنیز یا زرخیزید نہیں۔ بہ لحاظ وجوب حقوق دونوں ایک

سطح۔ بھوک جس طرح ایک کو لگے گی، دوسرے کو بھی۔ پھر بھی مرد کو عورت پر جسمانی و ذہنی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے ایک حد تک ترجیح و فضیلت حاصل ہے۔ علوم جدید خصوصاً نفسیات کے جن ماہرین نے اپنی عمر میں دونوں جنسوں کے طبعی خصوصیات، جسمانی قوت، اور دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے مطالعہ و تحقیق میں صرف کر دی ہیں، ان کی بڑی جماعت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے متمم و مکمل ہیں۔ تاہم بلحاظ قوت و بہ لحاظ عقل و فضیلت مرد ہی کو حاصل ہے اور عورت جن ملکوں میں مردوں کے برابر ثابت ہوئی ہے، وہاں اپنی نسائیت کا خون کر کے۔

اس اثبات فضیلت سے یہ مقصود ہرگز نہیں کہ افضل مفضل پر کسی قسم کا ظلم، زبردستی یا سختی شروع کر دے، یا اس کی تحقیر و تذلیل جائز سمجھ لے۔ بلکہ قوی کو کمزور سے اور زیادہ لطف و حسن مراعات رکھنا چاہیے۔ صحابی عبداللہ بن عباسؓ جس پایہ کے مفسر ہوئے ہیں، معلوم ہے۔ ان کا قول سنئے، جو قرطبی میں نقل ہوا ہے۔

قال ابن عباسؓ الدرجة اشارة الى حض الرجال على حسن المعاشرة والتوسع للنساء في المال والخلق ان الافضل ينبغي ان يتعامل على نفسه، قال ابن عطية هذا القول نفيس ماح -

ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ لفظ درجہ سے اشارتاً یہ ترغیب مرد کو ہو گئی کہ عورت سے حسن معاشرت رکھے، اور مال اور برتاؤ دونوں میں اس کے ساتھ تواضع برتے۔ اس لئے کہ یہ افضل ہی کی شان ہے کہ اپنے نفس پر برداشت سے کام لے، اور ابن عطیہؒ نے کہا ہے یہ قول بہت ہی نفیس اور مستحسن ہے۔

اور آیت کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوا ہے :-

واللہ عزیز حکیم ۵ اور اشد بڑا زبردست ہے اور حکمت والا ہے۔
 اشد بڑی قوتوں کا مالک ہے اور ہر مانع پر غالب ہے، وہ جو احکام اپنے بندوں کو
 چاہے دے سکتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ بڑا حکیم بھی تو ہے، وہ دنیاوی احکام ہے جو بیشمار
 حکمتوں اور مصلحتوں کے جامع ہوتے ہیں۔ بندوں بے چاروں کی نظریں کہاں کہاں تک
 پہنچ سکتی ہیں۔ اور اسی مثالی قوت و حکمت کے جلوے اور پر تو اس کے سائے
 ہی احکام معاشری و انتظامی میں نظر آتے ہیں۔

—: (۲۴) —:

زندگی سے محبت اور موت سے خوف، انسان کے لئے ایک امر طبعی ہے اس کا
 لحاظ کر کے جہاد و قتال کے سلسلے میں عین ترغیب و ترہیب کے درمیان قرآن ایک
 سبق آموز حکایت بھی کسی قدیم قوم کی بیان کرتا ہے اور چونکہ تذکرہ کا مدار اس قوم کی
 تعین پر نہ تھا۔ اس لئے اس قوم کے زمانے اور وطن کو بالکل محل جھوڑے رکھتا ہے اور
 انجام کا تعارف یوں کرتا ہے۔

الْمُتَرَالِ الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ
 حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ (آیت ۲۴۳)

(اے مخاطب) کیا تجھے خبر نہیں ان لوگوں کی جو اپنے گھروں سے نکل
 گئے تھے، موت کے ڈر سے، اور وہ ہزاروں ہزار تھے۔

روایت سے مراد ہمیشہ چشم بشارت ہی سے نہیں ہوتی بلکہ خبر معتبر پہنچ جانا، یا
 خود سفر سے متوجہ نکال لینا بھی مراد ہو سکتا ہے، چنانچہ یہاں یہی مراد ہے۔ قرطبی نے
 کہا ہے۔

هذه رواية القلب بمعنى الم تعلم یہ روایت قلب مراد الم تعلم کے

یعنی تجھے کیا اے مخاطب یہ روایت مستند نہیں پہنچ چکی ہے۔
اور یہ طرز مخاطب ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی جانے بوجھے واقعے کے
غیرت دلانا ہوتا ہے۔ راغب میں ہے

اِذَا عَجَزَی رَاٰیْتَ بِالِی اَمَضٰی مَعْنٰی النَّظَرِ الْمُؤَدِّی اِلِی الْاِعْتِبَارِ
جَب رَاٰیْتَ کَاَصْلَہ اِلٰی کَمَا تَحَدَّآتَاہُ یَہُ تَوَقُّفٌ کَسٰی وَتَعَرُّکٌ
غَبْرَتٌ دَلَا نَاہُ تَاہُ یَہُ۔

اور کشف میں ہے :

ہذا کلام جوی جوی المثل فی معنی العجب ،
”کسی عجیب واقعے کے لئے یہ طرز کلام آتا ہے۔“
گویا مخاطبین ادل اہل عرب کے لئے یہ واقعہ معروف و معلوم تھا اور
الوف کا عدد عربی میں ہزار ہا ہزار کے لئے آتا ہے۔ اس کا اطلاق کم سے کم دس ہزار
ہوتا ہے۔

فیہ دلیل علی الالوف الکثیرۃ (کشف)
”اس میں دلیل ہے کہ وہ بہ کثرت ہزاروں میں تھے۔“

وہو جمع الکثرة لا یقال فی عشرة فما دونہا (قرطبی)
”یہ عدد سبع کثرت کا ہے اور دس ہزار یا اس سے کم کیلئے نہیں بولا جاتا۔
اور حَدَّ النُّمُوتِ کی تصریح نے بتا دیا کہ اتنی بڑی آبادی کا گھروں سے باہر نکل
پڑنا یوں ہی اور امر اتفاقی نہیں، موت کے ڈر سے تھا۔“

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوتُوا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (آیت ۲۴۳)
”تو اللہ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ پھر اس نے انہیں جلا دیا۔“

یعنی اللہ کی مشیت میں ان کی موت ہی مقدر تھی اور جب اس نے یہ ارادہ کر لیا تو کوئی بھی

مدبر اس کی راہ میں مانع نہ آسکی۔ اور ممکن ہے کہ وہ حکم جہاد ہی کی تعمیل سے جی چڑا کر بھاگے ہوں۔ لیکن بالآخر وہاں سے یا کسی اور طریقہ سے، اُٹنے سے سب موت ہی کے شکار ہو کر رہے۔ سو حکم جہاد، جہاد سے بھاگنا، یا بھاگ بچنے کی کوشش کرنا سب بے کار ہے۔

ثُمَّ أَحْيَاهُمْ، پھر اللہ نے انہیں زندہ کر دیا اور انہیں مشاہدہ کرا دیا کہ موت و زندگی کا سرشتہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے۔ عقل و تدبیر انسانی کے ہاتھ میں نہیں۔ اسی لئے جہاد یا کسی بھی دوسرے حکم شریعت کی تعمیل سے بھاگ بچنے کی کوشش کرنا انتہائی حماقت اور نادانی ہے۔ کتاب عہد عتیق کے صحیفہ حزقی ایل باب ۳۷، آیات ۱ تا ۱۰ میں ایک روایت بہ صورت کشف و رویا اس سے ملتی جلتی ہوئی موجود ہے۔ اور بعض علما نے عصر نے قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے استناد کر کے یہاں موت و حیات دونوں کو صرف معنوی و مجازی مفہوم میں لیا ہے۔ ان تاویلات کی قرآن میں گنجائش تو نکل سکتی ہے، مگر یہ تکلف۔ اور آیت کا خاتمہ اس طے پر کیا ہے :-

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ

لَا يَشْكُرُونَ ۝ (آیت ۲۴۳)

”بے شک اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ البتہ انسان ہی اکثر شکر ادا نہیں کرتے۔“

چنانچہ فضل کرنے والا پروردگار بندوں کو حکم انہیں کے نفع کے لئے دیتا رہتا ہے۔ اور اس کا مقناویہ سبب کہ بندوں کے دل میں جذبات تمام تر محبت کے اور شکر و حسان مندی کے پیدا ہوتے رہیں اور قصے ہوں یا احکام پیچ پیچ میں ایسے مضمون ایسے ہی جذبات کی بیداری اور استحضار کے لئے آتے جاتے ہیں۔

————— (۲۵) —————

اس قدیم قوم کی حکایت کے، کہنا چاہیے کہ بعد ہی ذکر اسرائیل میں حضرت

سمویل کے زمانہ کی ایک جنگ کا شروع ہو جاتا ہے۔

الَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَأِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى
إِذْ قَالُوا لِنَبِيِّ لَهُمْ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلَ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ (آیت ۲۴۶)

راے مخاطب) کیا تجھے خبر نہیں کہ موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت
کی جب کہ ان لوگوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم لوگوں کے لیے ایک امیر مقرر
کر دیجئے کہ ہم اشر کی راہ میں قتال کریں۔

یہ پیغمبر حضرت سمویل تھے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے سے کوئی تین صدی بعد،
حضرت داؤد سے کچھ ہی قبل، اور سنہ مسیحی سے کوئی دس، گیارہ سو سال قبل مسیح ق م
سے تا سنہ ۱۰۲۰ ق م افرائیم و علاقہ شام کے کوہستانی شہر رامہ میں آپ کا قیام تھا۔ آیت
میں یہ بھی تصریح موجود ہی ہے کہ آپ اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے، آپ کے فرزندوں میں
سپہ سالاری اور قیادت کی قابلیت نہ تھی، ملک کے دشمنوں نے خاص طور پر اٹھایا تھا اور اسرائیلیوں
شکست ہو رہی تھی۔

مَلَأٌ عربی میں عام ہے۔ ہر صاحب قوت و اقتدار کے لئے ہے۔ یہاں یاق
میں مراد امیر جیش یا سردار فوج سے ہے۔ تو ریت میں اس موقع پر ہے:

”تب سارے اسرائیل بزرگ جمع ہو کر راہ میں سمویل کے پاس آئے اور

اس سے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے اب

تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے“

(۱۔ سمویل ۸ : ۲، ۵)

اسرائیلی تصور بادشاہی میں فوج کی سرداری لازمی تھی، اور یہ درخواست گزار
سب مذہبی لوگ تھے، ملک گیری و کشور کشائی مقصود نہ تھی، جنگ فی سبیل اللہ مقصود تھی۔ نقائل

کے ساتھ قید فی سَبِيلِ اللّٰہ کی درخواست ہی میں لگی ہوئی تھی اور یہ نہیں کہ خود جس کو چاہیں خود رانی سے سردار مقرر کریں۔ پھر وقت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست اُن سے کی کہ وہ امیر جیش کسی کو مقرر کریں۔

مذہبیت اور دینی ذہنیت کے ان مظاہروں کے باوجود پھر نفسیت بشری سے بھی خوب واقف تھے اور اپنی قوم کی نفسیت سے تو شاید کچھ اور زیادہ ہی۔

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَا تُقَاتِلُوْا
 ”بولے کہ میں یہ تو نہیں کہ تم پر قتال فرض کر دیا جائے اور پھر تم قتال نہ کرو“
 بلکہ کلمہ اھل سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سمویل یہی کچھ سمجھ بھی رہے تھے
 قَالُوْا وَمَا لَنَا اِلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاءِنَا رَاٰتِ

(قوم واپس) ”بولے کہ ہمارے لئے کیا ایسا باعث ہو سکتا ہے کہ ہم قتال نہ کریں خدا کی راہ میں بلکہ ہم اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے نکالے بھی جا چکے ہیں۔“

یعنی یہ بھی کوئی بات ہے کہ خود ہی آپ سے جنگ کا تقاضہ کرنے آئے ہیں اور جب اس کا حکم صادر ہو جائے گا اور جہاد فریضہ مذہبی خدا کی راہ میں تو اس حکم کے بعد اس کی تعمیل سے جی چرانے لگیں۔ خصوصاً جب کہ ہم کو ان کے ہاتھوں اتنے جانی و مالی نقصان بھی اٹھانا پڑ چکے ہوں! لیکن بات آخر ان کے پیسر ہی کی سچی نکلی۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ فَرَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ
 ”لیکن جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو وہ اب نکل گئے بجز ان میں سے تھوڑوں کے۔“

ان کے قدیم ترین مؤرخ جوزیفوس کی Antiquities of the Jews میں ہے:-

”ان پر دہشت طاری ہو گئی یعنی پہاڑوں میں چھپ گئے۔ بعضوں نے
ذیر زمین غاروں میں پناہ لی اور بہت سے لوگ تو اپنا ملک چھوڑ کر دیارے
یہاں عبور کر گئے“ (باب ۶ فصل ۶ فقرہ ۱)

اور اس حقیقت سے اندھے رہے کہ :-

وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (آیت ۲۲۶) اللہ خوب واقف ہے ظالموں سے۔

اپنے نافرمان بندوں اور ان کی سزا پر بھی ہر طرح قادر ہے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اسے بھی قرآن ہی کی زبان سے سنئے :-

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا (آیت ۲۲۷)

”ان کے پیغمبر نے ان لوگوں سے کہا کہ اللہ نے تم پر طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے۔“

یہ طالوت کون اور کیا تھے؟ نبی اور رسول کچھ نہ تھے محض امیر جیش تھے اور

ماریخ نے ان کو اسرائیل کا پہلا بادشاہ تسلیم کیا ہے۔ زمانہ حکومت ۱۰۲۰ قبل مسیح۔

لے کر ۱۰۱۰ قبل مسیح تک۔ توریت میں اس کا نام (Saul) ساؤل کر کے آیا ہے

توریت میں حسب معمول بڑی طوالت بیان کے بعد ہے :-

”سو جب سمویل ساؤل سے دوچار ہوا تو وہیں خداوند نے کہا کہ دیکھ یہی

شخص ہے جس کی بابت میں نے تجھ سے کہا تھا کہ یہی میرے لوگوں پر

ریاست کرے گا۔“ (۱۔ سمویل ۹ - ۱۵ - ۱۶)

اب اور آگے سنئے۔ سمویل نبی اپنی اُمت کے کیسے دُرُشّاس تھے، ان کی فراست توقع

سے بھی بڑھ کر ٹھیک نکلی۔ کہاں تو تقاضہ پر تقاضہ تھا کہ امیر جیش کا انتظام ہو جائے اور اب

جب خدائی انتخاب کے واسطے سے ہو گیا، تو لگے کہنے، واہ یہ بھی کوئی انتخاب ہو سکتا ہے۔

قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ

مِنْهُ وَلَكُم يَوْمَ سَعَةُ مِنَ الْمَالِ (آیت ۲۲۸)

”لو لے اس کو ہمارے اوپر امیری کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم امارت کے
حق دار اس سے بڑھ کر ہیں اور نہ اسے مال ہی میں وسعت دی گئی ہے۔“
طاوت کی جو حقارت اسرائیلیوں کے دل میں مٹھی ہوئی تھی۔ اس کی تھوڑی سی
شرح تاریخ کی زبانی بھی سن لیجئے۔

اسرائیلی بارہ قوموں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں سب کے چھوٹا قبیلہ بن یامین کا
تھا، اور طاوت اتفاق سے اسی قبیلہ کے تھے، تو ایک باعث ان کے حق پر سمجھے
جانے کا یہ نکل آیا۔ نسل و خاندان کی اہمیت جب جائز حدود سے بڑھ جاتی ہے، تو
ہندوؤں کی طرح ذات پات، بلکہ چھوت چھات کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوؤں کے
برہمن اور چھتری کی تفریق و امتیاز کی طرح اب اسرائیلیوں کا بھی عقیدہ یہ قائم ہو گیا تھا کہ
نبوت حق مخصوص ہے بنی لاوہ کا اور حکومت حق مخصوص ہے بنی یوداہ کا۔ یوداہ کا
قول تھا کہ طاوت نہ اس میں نہ اس میں، پھر حاکم یہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ جیسے ہندو عوام کی
سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کوئی شخص، نہ برہمن نہ چھتری وہ حاکم اعلیٰ یا سردار کیسے تسلیم
کر لیا جائے۔؟

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ برہمن یا چھتری نہیں ہیں نہ سہی، یہ ویش بھی تو نہیں۔
مہاجن یا ساہوکار طبقہ کے بھی تو نہیں، چاہے درجہ میں نہ سہی، کم سے کم مال و دولت ہی میں
ہمارے عوام سے ممتاز ہوں! منصب امارت کے لائق تو مالی اعتبار سے بھی نہیں!
مکالمہ میں آپ سامعین و حاضرین کا دل لگ رہا ہے؟ اب بنی وقت کا بیان
بھی سنئے۔

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي
الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۗ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكًا مَّن يَّشَاءُ (آیت ۲۳)
”فرمایا کہ اسے اللہ نے تمہارے مقابلہ میں انتخاب کر لیا ہے، اور اسے علم

اور جسم (دونوں) میں کشادگی زیادہ دی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے
اسے اپنا ملک دے دیتا ہے۔

آپ نے پہلا اور اصلی جواب تو یہی دیا کہ یہ انتخاب اللہ کا کیا ہوا ہے اور ظاہر ہے
کہ ہر طرح پر حکمت و مصلحت بھی ہوگا، بندوں کے ذہن بھی ان باریک مصلحتوں تک
نہیں پہنچ سکتے

توریت نے اسے یوں ادا کیا ہے :

” اور سمویل نے جماعت کو کہا کہ تم اسے دیکھتے ہو، کہ جسے خدا نے

بُچن لیا، تو اس کی مانند سارے لوگوں میں ایک بھی نہیں (۱ سمویل - ۱۰-۲۲)

اور دوسرا جواب عقلی قسم کا یہ دیا کہ تم اپنے معیار سے بھی دیکھ لو اور تمہارے معیار سے بھی سردار
فوج میں بس یہی دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ اسے سپہ داری اور ملک گیری کے فزون سے
واقفیت ہو، سو وہ طاقت کو حاصل ہے، دوسرے خود اس کی جسمی وجاہت و توانائی، اسکی
اہمیت اس زمانہ کی دست بہ دست لڑائیوں میں ستم تھی اور طاقت اس میں بھی ممتاز تھے۔

۱۷۸ فِي الْعِلْمِ سے مراد سیاق میں علوم ملک گیری و ملک داری کے ہیں، ابن عباسؓ
نے کہا ہے اِی علم الحرب اور روح المعانی میں ہے من حرفة الامور السياسية۔
فِي الْجِسْمِ مراد ہے کہ قد و قامت اور وجاہت ظاہری میں طاقت و سردی
بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں اِی فی الطول والقوة۔

توریت کی دسی ہوئی تفصیلات سے طاقت کے حلیہ کا نقشہ ذہن میں جمائیے۔

” بہت خوب جوان تھا اور بنی اسرائیل کے درمیان اس سے زائد

خوب صورت کوئی شخص نہ تھا۔ یہ ساری قوم میں کا ندھ سے لے کر اوپر تک

ہر ایک سے اونچا تھا۔“ (۱ سمویل ۹-۱)

ایک فذمری جگہ :-

”اور وہ جماعت کے درمیان کھڑا ہوا تو شاؤں سے لے کر اد پر تک سب

لوگوں سے لمبا تھا (۱۔ سمویٰ - ۱۰ = ۱۳)

اور یہ دراز قامتی، اسرائیلوں کے ہاں کوئی معمولی صفت نہیں، بڑی اہم اور ضروری صفت سرداری کے لئے تھی، تدریت کے بعد مقدس ترین فوشہ ان لوگوں کے ہاں تلو د ہے۔ ذرا اس کی تصریح ملاحظہ ہو:

”خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی سیکنت کا نزول صرف اسی شخص پر کرتا ہے

جو دانشمند ہو مضبوط ہو، اور دراز قامت ہو“

EVERY MAN :

TAL MOOD (۱۲۸ ت)

قرآن مجید کی اس نکتہ رسی کی داد دیجئے کہ اس نے نام ہی ایسا رکھا جس سے طول بنتی کی طرف پورا اشارہ ہو رہا ہو۔ ہمارے ہاں کے اہل تحقیق کا گروہ اسی طرف گیا ہے۔

چنانچہ صاحبِ معالم نے کہا ہے کہ مکان طالوت اسمہ بالعبرانیۃ ساؤل فسمی طالوت بطولہ۔ اور روح المعانی میں ہے، قال انه عربی من الطول واصله الطولون۔

يُوَفِّي مَلِكُهُ مَنْ يَشَاءُ، اس کی ملک تو ہر ملک ہے وہی اپنا ملک جس کو چاہے دے دے۔ وہی ہر طرح مالک و مختار ہے اور آیت کا توڑ ان مختصر لفظوں پر ہوا ہے۔

وَاللَّهُ قَاسِعٌ عَلَيْهِمْ جسے اردو میں یوں کہیے کہ اس کا اختیار بھی غیر محدود اور اس کا علم بھی محیط کل — وہ بڑی ہی وسعت والا ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، وہی ہر سیت کو بلند اور ہر ادنیٰ کو سرفراز کر دینے والا ہے اور اس کا علم بھی محیط و کامل ہے، وہی تو واقف ہے کہ کون ملک داری اور ملک گیری کی صلاحیت رکھتا ہے۔

نہی اپنی اُمت کی اعجوبہ پرستی اور خوارقِ پسندی سے واقف تھے، جوابات تو

ان کے اعتراض کے معقول و کافی دے چکے تھے، پھر بھی کچھ دیر مغز پاشی ضروری مناسب
سلم ہوئی۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ
التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ
آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُمُ إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ (آیت ۲۴۸)

”ان کے نبی ان سے بولے، کہ اس کی امارت کا نشان (یعنی جو تمہارے
اطمینان کا کام دے سکے) یہ ہے تمہارے پاس وہ صندوق (از خود)
آجائے گا۔ جس کے اندر تمہاری تسکین کا سامان تمہارے پروردگار کی طرف
سے ہے، اور کچھ بچی ہوئی چیزیں بھی، جنہیں آل موسیٰ و آل ہارون چھوڑ
گئے ہیں، اسے فرشتے لے آئیں گے۔ بیشک اس واقعہ میں تمہارے لئے
نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو۔“

تقریر میں تابوت سکیئہ ایک قصہ طلب لفظ آگیا ہے۔ اس تلمیح کو آپ بھی
سمجھ لیجئے تو تحقیقی بالکل کھل جائے اور بات خوب روشن ہو کر رہے۔

یہ اصطلاحی نام ایک خاص تابوت کا ہے، جو بنی اسرائیل کا اہم ترین فرمی دلی ورثہ تھا
اس کے اندر اصل نسخہ توریت کا تھا، اور انبیاء و بنی اسرائیل کے تبرکات محفوظ تھے، اسرائیل
اس کو برکت و تقدیس کی متاع عزیز سمجھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ بڑا انتہائی احترام کا
رکھتے تھے۔ سفر و حضر، جنگ و امن ہر حال میں اسے بڑی عزت و حفاظت کے ساتھ
اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور اپنی ساری خوش بختی اس کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے۔ یہ صندوق
کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ موجودہ علمائے یہودی کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش یہی: طول ۲
فٹ، عرض ۱ فٹ، بلندی ۱ فٹ۔ مدت دراز ہوئی فلسطینی ایک جنگ میں

ان سے یہ چھین لے گئے تھے، اسرائیلی اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست اور بدطالعی سمجھ اس کی بازیابی کے لئے نہایت درجہ مضطرب و پریشان تھے۔ طاوت کے وقت میں اس کی واپسی کے بعد یہ تابوت ان کے قبضہ میں حضرت سلیمان (متوفی ۹۳۲ ق م) تک رہا، اور آپ نے بیت المقدس میں یہی سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسے بھی اسی میں رکھ دیا تھا، اس کے بعد سے پھر اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت یہی سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن کر دیا گیا ہے۔

قرآنی لفظ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ سے خصوصی اشارہ توریت شریف کے نسخہ اشفا کی جانب ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کی چھوڑی ہوئی چیزوں سے مراد ان دونوں پیغمبروں اور ان کی بزرگ اولاد کے تبرکات و آثار ہیں۔

تاریخ یہود کا بیان ہے کہ فلسطینی اس مقدس تابوت کو چھیننے کو تو چھین لائے۔ لیکن جب سے ایک دن بھی چین سے نہ بیٹھنے پائے۔ ابھی وبا کا زور ہے۔ ابھی کوئی اور مصیبت، آخر عاجز آکر یہ طے کیا کہ خود تابوت یعنی اس نحوست کی پوٹ کو کہیں اور پھنک لو یا جائے۔ چنانچہ ایک بیل گاڑی پر اسے لا کر بغیر گاڑی بان کے یوں ہی ہانک دیا۔ بیل سیدھے علاقہ بنی اسرائیل کی طرف روانہ ہو گئے اور گاڑی اُن کے شہر بیت شمس میں آکر ٹھہر گئی۔

تَحْمِيلُهُ الْمَلَكَةَ کی خبر کو حیرت کے کاغذوں سے نہ سنیئے۔ ایسے موقعوں کے لئے ہمیشہ یہ نکتہ حافظہ میں رکھیئے کہ تکوینی تصرفات جب بھی حکم الہی سے ہوتے ہیں، کیا معمول کے موافق کیا معمول سے الگ، ہمیشہ فرشتوں ہی کے ذریعے ہوتے ہیں اور کلام الہی میں ہر فعل و عمل کے لئے محاورہ فرشتوں ہی کا استعمال ہوتے ہیں۔ پانی سے بھرے ہوئے بادل فرشتے ہی لاتے ہیں۔ آندھی کے جھکڑ فرشتے ہی چلاتے ہیں، قحط، وبا، زلزلے سب فرشتوں ہی کی معرفت ظہور میں آتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی

بیلوں کا رخ اسراہیلی حلاقوں کی جانب پھیر دینا فرشتوں ہی کا کام تھا۔ یہ ایک غیبی نشان تھا، طاوت کی تائید میں اور مبارک خال تھی اس کے حق میں۔ اس خیریت سرانگیز واقعہ بازیابی ثابوت کی طرف اشارہ کر کے نبی وقت اپنی امت سے کہتے ہیں کہ تمہارے اطمینان کے لئے نصرت غیبی کا ثبوت موجود ہو گیا۔ اس فیصلہ دہاں اور مذاکرے اور مکالمے کے بعد، جب امت طاوت کی کمان میں، قتال پر آمادہ و مستعد ہو گئی تو خود سردار پیش کردہ ایک ضرورت گفتگو کی فوج والوں سے پیش آگئی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ

بِشَهْرٍ (آیت ۲۳۹)

”جب طاوت فوج والوں کو لے کر آگے بڑھے تو بولے کہ اللہ

تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعہ لینا چاہتا ہے۔“

جس دریا کا ذکر ہے وہ فنا نہیں ہو گیا ہے، آج تک موجود ہے، اس کا نام اردن

انگریزی تلفظ میں (Jordan) کوئی بڑا دریا نہیں، کنا چاہیے کہ منبع سے دہانہ

تک براہ راست لمبائی کل ۳۳ میل کی۔ البتہ درمیانی پیچ و خم ملا کے لمبائی کی میزان کوئی

تین سو میل تک پہنچ جاتی ہے۔ علاقہ فلسطین میں گویا اہم ترین دریا یہی ہے۔ اور علاقہ

کی قدرتی سرحد کا کام بھی یہی دیتا ہے چنانچہ دریائے اس پار اور اس پار (ایس وے اور اے وے) کے علاقوں

کی تقسیم خود نویت میں موجود ہے۔ اور بیضا کریمہ یوشع کے باب اول کی آیات ۱۲-۱۵ میں ہے۔ اس کا بہاؤ

شمال سے جنوب کی جانب ہے اور بحر جلیل (Sea of Galilee) اور بحر طبریہ

(Sea of Tiberias) ہوا بحر المیت یا بحر مردہ (Dead Sea)

میں جاگرتا ہے۔ پانی شروع کے حصہ میں صاف و شفاف بخش و شیریں ہے۔ لیکن آگے

چل کر گندلا، بدبودار اور بضر صحت ہو جاتا ہے۔

تو تمہارے صبر و ضبط (ڈسپلن) کا امتحان، مشیت و حکمت الہی سے اسی دریا

کے ذریعہ سیر ہو گا۔

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ

”پس جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا وہ میرا نہیں ہے۔“

وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اعْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ

”اور جو کوئی اسے نہ چکھے گا وہی میرا ہے، ہاں کوئی ان میں چلو بھرا اپنے

ہاتھ سے پی لے (تو اس کا مضائقہ نہیں)

”میرا نہیں ہے“ سے یہ مراد نہیں کہ وہ میرے دین و کیش سے خارج ہے، بلکہ مراد

یہ کہ میری فوجی اطاعت سے باہر ہے، اور سرے قائم کئے ہوئے ڈسپلن کا پابند نہیں۔

روایتوں میں آتا ہے کہ موسم گرمی کا تھا اور سپاہیوں کو پیاس زور کی لگی ہوئی تھی۔ اور معلوم

ایسا ہوتا ہے کہ اصل حکم تو وہی ملا تھا کہ کوئی بھی راستہ میں یہ پانی زبان پر نہ رکھے۔ اور یہ

دوسرا حکم بہ طور نصرت و اجازت تھا، کہ خیر ایک آدھ چلو سے منہ تر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں

۔۔۔ باقی قصہ آگے سنئے :

فَشَرَبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ

پی لیا، بجز ان میں چند آدمیوں کے

یعنی خلافتِ حکم ابھی طرح سیر ہو کر پی لیا۔ جس کے بعد چلنا خصوصاً فوجی مارچ کرنا قدرتنا دشوار

ہو گیا۔ باز رہنے والوں کی تعداد جو قرآن نے تھوڑی ہی بتائی ہے، وہ حسبِ اہمیت و قربت

تقریباً چھ سو تھی۔ تب سمویل نے ان لوگوں کو جو اس کے پاس حاضر تھے، گنا اور وہ

مردِ قریب چھ سو کے تھے (۱۔ سمویل - ۱۲ = ۱۵)

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ

لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ (آیت ۲۳۹)

”پھر طاقت اور جو مؤمنین ان کے ساتھ تھے، دریا کو پار کر گئے۔ تو وہ لوگ

بولے آج تو ہم میں جاوے اور اس کی فوجوں سے مقابلہ کی سکت نہیں۔
 جاوے فلسطینیوں کے لشکر کا سردار بڑے تن و توش کا پہلوان تھا۔ انسان کا ہے کو
 تھا، اچھا خاصا دیوزاد تھا۔ توریت میں اس کی جسامت، قد و قامت، اسکی شہ زوری
 اس کے ہتھیار، ان سب کی تفصیلات موجود ہیں، ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا
 قد دس فٹ کا تھا، بجز ہیرے کے سب سے بڑا آہن پوش رہتا تھا، اور اس کی
 پیر کا وزن کوئی تین من کا تھا۔

دشمن کو اپنے سے قوی و زبردست پا کر اچھے اچھے ایمان والوں کی بہت طبعی
 طور پر جواب دے جاتی ہے۔ جو نفیس اسرائیل کی تاریخ آثار یہود میں ہے کہ طاقت
 اور اس کے لشکر یہ سامان دیکھ کر ہم اٹھے، (باب ۶ - ۹ = ۱۰)
 اور خود توریت کا بیان ہے۔

” جس وقت ساؤل اور سارے اسرائیل نے اس فلسطینی کی بات سنی
 تو ان کی دلادری نکل گئی، اور وہ نہپٹ ڈر گئے“ (۱۔ سموئل - ۱۷ - ۱۱)
 قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا اللَّهِ ۖ كَمْ مِنْ فِئَةٍ
 خَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ
 مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (آیت ۲۴۹)

” وہ لوگ جنہیں یقین تھا کہ وہ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، بولے
 کہ بارہا چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں اور
 اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

طاقت کے لشکر میں مومن تو بھی تھے، لیکن بہتوں پر دشمن کے ظاہری ساز و
 سامان کی دہشت طاری ہو گئی، اور طبعی طور پر اس کی شان و شوکت سے مرعوب ہو گئے۔
 البتہ کچھ ایسے بھی تھے جن میں آخرت کا عقیدہ تروتازہ اور مستحضر تھا، وہ اس وقت پر

بھی اپنے ایمان پر استقلال کے ساتھ قائم رہے اور ذرا بھی متزلزل نہ ہوئے اور حقیقت تو یہی ہے کہ اللہ صابرین کا ساتھی ہے۔ اس کی نصرت و توفیق انھیں لوگوں کے ساتھ ہے اور آخرت کا انحصار جن لوگوں میں ہے وہی ان میں جرات و بے خوفی پیدا کرتا ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥﴾

”جب جالوت اور اس کے لشکریوں کے مقابل آئے تو بولے کہ اے

پروردگار ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدم جمادے اور ہمیں غالب کر کافر لوگوں پر“

یہ دو آیتیں جو ابھی آپ کے سامنے تلاوت ہوئیں، ان میں عام تعلیم اللہ کے پیارہوں کو آداب جنگ کی ہے کہ کمال تکیہ پیارہوں کو بجائے اپنی قوت و شوکت کے نصرت الہی پر ہونا چاہیئے۔

قرآن کا بیان تو آپ سنتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ اور تورات کا بیان جس کا جی چاہے، خود تورت میں پڑھ کر دیکھ لے، تورت میں نفس جنگ کے خشاک و خاز جی واقعات تفصیل قرآن سے کہیں زائد ہے۔ اور وہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ گریا کوئی کتاب تذکرہ و تاریخ کی ہے۔ قرآن مجید اس کے برعکس ہر موقع پر تعلیم، اصول توحید اور اخلاق عالی کی دیتا جاتا ہے، اور یہی وہ اس موقع پر بھی کر رہا ہے۔

چنانچہ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا میں سب سے پہلے ہی درخواست کی ہے، کہ ہمیں توفیق صبر و ثبات قلب کی ہو، اور ثَبِّتْ أَقْدَامَنَا میں صراحت اسی دعا کی ہے کہ ہمیں ثبات قدم نصیب ہو۔ یہی وَانصُرْنَا کی دعا تو ثبات قلب و ثبات قدم کے بعد دشمن پر ظفر و غلبہ تو شاید بہ طور قدرتی فتح کے حاصل ہو ہی جاتا۔ لیکن مومنین صادقین کی نظر اپنے سارے انتظام اور ساری سعی و تدبیر سے کہیں بڑھ کر نصرت و تائید الہی پر رہتی ہے

اور پھر آخر میں صراحت عَلَي الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ کی ہے۔ یعنی جنگ کوئی ملکی یا دنیوی نہیں دینی و اعتقادی ہے، مقابل محض دشمن نہیں، کافر ہیں مفسود فاسق اور غلبہ دشمنوں پر نہیں، بلکہ کافروں اور دین کے دشمنوں پر ہے۔

فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ (آیت ۲۵۱)

”پھر انھوں (طاووت والوں) نے انھیں (جالوت والوں کو) شکست دیدی“

اللہ کے حکم سے اور جالوت کو داؤد نے قتل کر ڈالا۔

بِإِذْنِ اللَّهِ کی قید ملاحظہ رہے۔ اذن توفیق کے معنی میں ہے۔ مقبولین کا کوئی سا بھی کارنامہ ہو اس قید سے بچھا چھوڑنے نہیں پاتا یا دوہانی ہر جگہ ہوتی رہتی ہے کہ بند بچا کر کیا کرے گا۔ جب کچھ بھی اس سے بن پڑتا ہے، تاہم توفیق حق ہی سے ہوتا ہے۔ جنگ و ترتیب جنگ کی نظر کشی تربیت میں بھی ہے، لیکن بس وہی فکری نقطہ نظر سے دَقَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ، دشمن کے بطل جلیل اور سردار اعظم جالوت کی ہلاکت داؤد کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ داؤد کن تھے؟ آگے چل کر تاریخ اسرائیل کے ایک نامور ہیرو بنے۔ ملک و سلطنت سے سرفراز ہوئے اور نبوت سے بھی۔ اس وقت لشکر طاووت کے ایک عام سپاہی تھے، زمانہ حکومت ۱۲۰۰ ق۔ م سے ۹۷۰ ق۔ م تک رہا۔

قرآن مجید میں آپ کا ذکر چھ مرتبہ آیا ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس نو عمر سپاہی نے ایک پتھر اپنے فلاخن میں رکھ کر ایسا اس کے کھینچ کر مارا کہ پتھر اس کے ماتھے کو توڑنا ہوا اس کے دماغ کے اندر پیوست ہو گیا اور جالوت تڑپ کر معاذ نبی سے نصرت ہو گیا۔

فَاتَّخَذَ اللَّهُ الْمَلَكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ (آیت ۲۵۱)

اور اٹھرنے سے حکومت عطا کی اور حکمت بھی اور اسے سکھایا جو کچھ کہ چاہا۔

یہ بادشاہی ایک خدائی عطیہ تھی۔ پہلے تو قرآن نے اسی کو صاف کیا ہے کہ یہ فرمانروائی ان کے واسطے قوم اسرائیل کو عطا ہوئی تھی۔ آپ نسل اسرائیل کے دوسرے تاجدار ہوئے ہیں

پہلے تاجدار طاوت تھے اور آپ ان کے داماد بھی تھے۔ طاوت جب اپنے بڑے فرزند کے ساتھ میدان جنگ میں کام آگئے تو قبیلہ یہودانے آپ کو بادشاہ منتخب کیا اور دو سال کی کشاکش کے بعد قوم کے باقی قبیلوں نے بھی آپ ہی پر اتفاق کر لیا۔ سات سال تک آپ نے پایہ تخت ہبرون (Hebron) کو رکھا۔ اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے چھڑا کر اسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔ گردو پیش کے حکمرانوں کو مسخر و مغلوب کیا۔ اپنے حدود سلطنت کو خوب وسیع کیا۔ آپ کا عہد حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحات اور حسن انتظام کے لحاظ سے یادگار ہے۔

وَالْحِكْمَةُ حُكْمٌ لِّقَلْبٍ مَعْنٰی دَانائی کے ہیں۔ یہاں مراد نبوت ہے، جو خود انتہائی نام دَانائی کا ہے عَلَمٌ مِّمَّا يَشَاءُ علوم انبیاء کا احاطہ کون کر سکتا ہے۔ مِمَّا يَشَاءُ کے عموم میں وہ تمام علوم و فنون و صنائع آگئے جو آپ کو تعلیم ہوئے تھے۔
قصہ طاوت طویل ہو کر بیان ہوا۔ آخری آیت کا آخری ٹکڑا بہ طور ضمیر یا تکرار کے ہے اور اسی میں قصہ کا خلاصہ بھی آگیا۔

وَلَوْلَا دَفَعُ اللّٰهُ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ
الْاَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ (آیت ۲۵۱)
اور اگر اللہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو روئے زمین پر
فساد برپا ہو جاتا۔ لیکن اللہ تو جہاں والوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے
اس لئے اللہ اپنے فضل و کرم سے اس فسادِ عظیم کی نوبت نہیں آنے دیتا اور بدکاروں کو
نیک کاروں کے، اور نافرمانوں کو فرمانبرداروں کے ذریعہ ہٹاتا اور مٹاتا رہتا ہے لَفَسَدَتِ
الْاَرْضُ کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بدی و بدکاری سے روئے زمین پر فسادِ عظیم برپا ہو کر رہتا۔
یہاں یہ عام قانون بتا دیا گیا کہ دنیا کی حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہو کرتے
ہیں یہ یونہی بلا ضرورت و مصلحت محض گردشِ گردوں سے نہیں ہو جایا کرتے بلکہ ہمیشہ با مقصد

پڑھکتی ہی ہو کرتے ہیں۔ اور ان سے ظلم و طغیان و عصیان کی اصلاح مد نظر ہوتی ہے اور ہمیں اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے کہ اس عالم اسباب میں مثبت تکوینی جو کام بھی لیتی ہے، بندوں ہی کے ذریعہ واسطے سے لیتی ہے اور روئے زمین پر فساد عظیم کے برپا ہو جانے پر جو شے روکے ہوئے ہے وہ اللہ کا فضل عظیم ہی ہے۔

یاد کر لیجئے اس لمبے قصے کے ذرا قبل حکم جہاد کا ملا تھا، اور ترغیب قتال کی شروع ہوئی تھی، طریق جہاد، آداب جہاد، متعلقات جہاد کے سلسلے میں کتنی ہدایتیں کتنی بصیرتیں اس ایک تاریخی قصے کے ضمن میں فراہم ہو گئیں۔

————— بیچ (۲۶) بیچ —————

اس قصہ کے خاتمہ پر معارف و مثنیٰ سخن براہ راست صاحب قرآن کی طرف ہو جاتا ہے اور آپ سے مخاطب ہو کر ارشاد ہوتا ہے۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَنْزِلُهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (آیت ۲۵۲)

یہ اللہ کی آیتیں ہیں کہ ہم انھیں آپ کو (اے رسول) پڑھ کر سناتے ہیں
ٹھیک ٹھیک۔

بالْحَقِّ یعنی غرض صحیح کے ساتھ اور بالکل بے کم و کاست۔ یہ گویا پرزور ملامت اس کا کہ صحیح و مستند بیان قرآن ہی کا ہے۔ یہ نہیں کہ دوسری الہامی کتابوں اور مذہبی نوشتوں کی طرح کے قصے آدھورے یا مبالغہ آموز یا مسخ شدہ ہو کر رہ گئے ہوں۔ اور اسکی ایک واضح مثال یہ قصہ طالوت ہی ہے۔ بائبل والوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (آیت ۲۵۲)

تو آپ یقیناً فرستادوں میں سے ہیں۔

آپ اپنے پیغمبر برحق ہونے میں اصلاً شک و شبہ نہ کیجئے۔ اور حقانیت کا نزول برحق پیغمبروں ہی پر ہوتا ہے۔ لفظ المرسلین کی معنویت قابل غور ہے، انبیاء کی حیثیت اسلام میں تا مگر قاصدوں، سفیروں، فرستادوں اور بھیجے ہوؤں کی ہوتی ہے اور جو مرسل (بھیجا ہوا) ہوتا ہے وہ کسی کی طرف سے کسی کے پاس ہی بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ یہ مرسلین یا پیامبر نہ اوتار ہوتے ہیں نہ درویش، نہ خدا کے منظر ہوتے ہیں۔ نہ خدا ان کے اندر حلول کئے ہوتا ہے۔ معبودیت یا نیم معبودیت کی صلاحیت ان میں ذرا بھی نہیں ہوتی۔ اللہ اکبر! — شرک بلکہ شائبہ شرک سے بچنے کا بھی قرآن مجید کو کتنا اہتمام ہے الفاظ تک کے انتخاب میں وہ اس کا کیسا لحاظ رکھتا ہے۔

لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ کی ترکیب سے یہ بھی نکل آیا کہ آپ دنیا سے نزلے یا انکے کوئی مرسل نہیں بلکہ آپ اس ذمہ مرسلین کے ایک فرد ہیں جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں۔

—: پیچھا ۲۷: —

اور اس سلسلے میں یہ مسئلہ بھی کس خوبی سے حل کر دیا ہے۔ کہ پیغمبر پیغمبر سب یکساں مرتبہ عظمت و احترام کے نہیں ہوتے۔ گو احترام مشترک سب میں رہتا ہے۔ بادشاہ کے صوبہ داروں میں تفاضل بھی پایا جاتا ہے، گو فضیلت سب میں مشترک ہوتی ہے اور شرف و قرب سے کوئی خالی نہیں ہوتا

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (آیت ۱۵۳)

اور رسولوں میں ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دے رکھی ہے۔
فَضَّلْنَا میں ضمیر جمع مکمل کا خیال رہے۔ یہ تفضیل و افضلیت جو کچھ ہے وہ محض عند اللہ ہے، خالق کے ہاں درجات و مراتب قرب کے اعتبار سے ہے۔ خلق کے لئے بحیثیت مطاع و مقتدا سب یکساں ہیں۔ اکرام و تعظیم سب کی واجب ہے (اور اسی

معنی میں قرآن مجید کی ایک دوسری آیت کا جزو اسی پارے کے اندر لگا نفیر قُبُورِ
أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ آ رہا ہے) چنانچہ:

مِنْهُمْ مَّنْ حَكَّمَ اللَّهُ

انہیں میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا ہے (براہ راست بلا واسطہ ملائکہ)

جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ موسیٰ کلیم اللہ کے لئے آیا

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَكَانَ كِتَابُكَ فِي الْمَقَامَاتِ
ہیں جیسے ہمارے رسول سرورؐ بسیار جامع کمالات و خاتم النبوت تھے مفسر و مخبر
نے یہ خوب کہا ہے کہ جہاں شناخت و تعین میں کوئی وقت نہ ہو وہاں کنایہ صراحت سے
بڑھ کر تلخ و مؤثر ہوتا ہے:

وَاتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَ وَآيَدْنَا

بِرُوحِ الْقُدُسِ (آیت ۲۵۳)

اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے شواہد عطا کئے اور ہم نے ان کی تائید کی روح القدس کے

ذریعے (کہ وہ بھی انہیں پیران برحق میں سے تھے)

ابن مَرْيَمَ - یعنی مریم نامی ایک خاتون کے فرزند، ابن اللہ یا کچھ اور - عیسیٰ

علیہ السلام بہ ایں مرتبہ و جلالت بہر حال ایک بشر ہی گوشت و پوست کے بنے ہوئے

اور انسانی شکل و صورت رکھنے والی ہی عورت کی اولاد تھے، نہ خدا تھے نہ خدا زادے،

نہ الوہیت کا کوئی شاہد اپنے اندر رکھتے تھے، انہیں خدا کا بیٹا ٹھہرانا بڑی جہالت تھی،

اور اسی لئے تو ضرورت پیش آگئی انہیں صراحت کے ساتھ ابن مریم کہنے کی، کہ محض اسی

نشان و ہی سے اور اسی پتے ہی سے ضرب لگ جائے عقیدہ نصرانیت پر، ورنہ قرآن نے اتنے

پیغمبروں کا ذکر کیا ہے، کسی کا تعارف یہ کہ نہ کرایا کہ فلاں ابن فلاں - اس طرح کا تعارف

مخصوص ہے ابن مریم کے لینے - کہ انہیں کے لئے تو عقیدہ ابن اللہیت کی تردید کی

ضرورت تھی نہ البتات یعنی شواہد ان کی حقانیت و پیغمبری کے۔ اور اس کے تحت وہ دلائل و خوارق سب ہی آگئے جنہیں دیکھ کر ہر عقل سلیم نبوت عیسوی کی قائل ہو جائے۔ ابھی تردید ہو رہی تھی شرک نصرانیت کی، اب تردید ہو رہی ہے الحاد یہودیت کی۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ پیغمبرِ برحق اور مؤیدِ من اللہ تھے۔ نہ کہ نعوذ باللہ شعبہ بازی باز یا بازی گر، نصرانیوں نے جس طرح غلو و افراط کر کے آپ کو حدِ عبودیت سے اُنچا اچھال دیا تھا۔ اسی طرح یہود نے عناد و تعریط سے کام لے کر آپ کو بازی گر و شعبہ باز قرار دے دیا تھا۔ امر حق اور قولِ فیصل اب قرآن کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔

وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ کہ روح القدس قدم قدم پر آپ کی محافظت و رافعت و شمول سے کرتے تھے۔

یہ روح القدس عیسائی تثلیث والے کوئی اقنوم نعوذ باللہ نہ تھے۔ بلکہ اسلامی اصطلاح میں یہ لقب ہے فرشتہ، عظیم حضرت جبریل کا، جبریلی ملکوتی مخلوق ہیں عند اللہ نہایت مقرب۔ لیکن بہر حال مخلوق ہی ہیں، اور کوئی بھی شائبہ الوہیت کا اپنے اندر نہیں رکھتے۔ وَاَيَّدْنَاهُ ان کی تائید ہم نے کی، جو قادر علی الاطلاق ہیں، اور یہ تائید کوئی خود بخود تو نہیں مل گئی۔ آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ عیسیٰ مسیح بدایں ہمہ فضائل کمالات بہر حال انسان ہی ہیں۔ انسانوں کی طرح دفع ضرر اور حصول نفع دونوں کے لئے دستگیرِ مٹی حق کے محتاج۔ اور قدرت کاملہ نے ان کی حفاظت، رفاقت، و تقویت کے لئے دیوٹی ایک دوسری مخلوق لطیف و غیر مرنی جنس کی لگا دی !

— (۲۸) —

آیت الکرسی کی مشہور آیت سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کی تہید کی آیت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ

أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خِلَافَةً وَلَا شَفَاعَةً وَالْكَافِرُونَ
هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ (آیت ۲۵۲)

اے ایمان والو جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو اللہ
کی راہ میں، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ تجارت کام آئے گی نہ دوستی

اور نہ سفارش اور کافر ہی تو ظالم ہیں۔

انفاق یعنی صرف مال کا ذکر سیاق مدح میں جہاں کہیں بھی قرآن مجید میں آتا

ہے، ظاہر ہے کہ نیکی یا راہ خدا ہی میں آتا ہے۔ اس کے لئے یہاں پہلے ہی کتنی بار
یاد دہانی کر دی گئی ہے کہ جس مد میں بھی خرچ کرو گے، وہ آمدنی آتی کہاں سے ہے۔
بہر حال اشتر ہی کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ تو اس مال عطیہ الہی کو اسی دنیا میں نیک کاموں
میں قبل قیامت خرچ کر دو، اور قیامت کا نام بجائے صراحت سے لینے کے، اس کا تعارف
ان علامتوں سے کرایا ہے، کہ

- (۱) اس دن کسی طرح کی سودا بازی، لین دین، خرید و فروخت نہ ہو سکے گی،
- (۲) اور نہ کوئی محبت و دوستی اور قربت داری کا رشتہ چل سکے گا،
- (۳) اور نہ کسی بڑے شخص کی سعی و سفارش، اس کی وجاہت، مروت یا دباؤ کی
بناء پر قابل قبول ہوگی،

لیکن نفی صراحت کے ساتھ ان تین مدوں کی کیوں؟ وجہ یہ کہ یہی تین گمراہیاں تو
شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ گمراہ قوم اول تو حشر و یوم حساب کی قائل کہاں
تھیں؟ اور جو اہل کتاب کے اثر سے، یا خود اہل کتاب قومیں، تھوڑی بہت اس کی
تھیں بھی، تو طرح طرح کی پختہ عجب عجب نگار رکھی تھیں، کہیں عقیدہ تھا کہ اہل ثروت تو
وہاں بھی مالدار ہوں گے۔ اپنی بدیاں کچھ دے دلا کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینگے
اور ان کی نیکیاں کچھ خرچ کر کے اپنی طرست منتقل کر لیں گے۔ اور کہیں یہ عقیدہ تھا کہ

دوستی عزیز داری کی بنا پر یہ کاریاں حسناات میں تبدیل ہو جائیں گی، اور سبک بڑھ کر یہ عقیدہ پھیلا ہوا تھا کہ فلاں فلاں بزرگ آباد اجداد مقبول و مقرب اپنی سفارش کے ذریعہ اپنی اولاد کو یا اپنے جاننے والوں کو بچھڑا لائیں گے۔ یہ آخری فتنہ سبک بڑھا ہوا تھا اور دین نصرا نیت کی بنیاد ہی ان دو عقیدوں پر ہے۔ ایک عقیدہ کفارہ، جس کے معنی یہ ہیں کہ ابن اللہ نے ساری دنیا کے گناہگاروں کی طرف سے فدیہ یا کفارہ بن کر اپنی جان سولی پر دے دی۔ اور دوسرا عقیدہ شفاعت، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح ابن اللہ کا مستقل منصب شافع مطلق کا ہے۔ عرش الہی پر متمکن یہی کئے جائیں گے اور بے دلیل شفاعت کر کے اپنے ماننے والوں کو نجات دلواتے جائیں گے۔

اسلامی شفاعت جو ہے، وہ کوئی مستقل شفاعت ہی نہیں بلکہ ایک صورت مقبولین کی دعا کی ہے۔ مقبولین حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ایسا پاکر درخواست کریں گے، دعا کریں گے کہ فلاں فلاں کے قصوروں کو، خطاؤں کو نظر انداز کر کے انھیں مغفرت سے نواز دیا جائے۔ اور یہ دعا ان لوگوں کے حق میں قبول ہوگی۔ چنانچہ اسی آیت الکرسی کے دوسرے ٹکڑے میں ہے!

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَكَ إِلَّا بِإِذْنِهِ

کون ایسا ہے جو اللہ کے آگے شفاعت کر سکے، ہاں ہو اس کے کہ اسی کی اجازت سے ہو۔

یعنی شفاعت تو ماستر حق، حق تعالیٰ ہی کا ہے۔ **لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا** ہاں وہی خود جس کسی کو چاہتا ہے اس کا مجاز کر دیتا ہے اور یہ ظاہر اس کی درخواست قبول کر کے اس کا اعزاز سب کی نظر میں دوبالا کر دیتا ہے۔

جاہلی اور نیم جاہلی قوموں کی گمراہیاں اگر پوری طرح نظر میں ہوں تو ان آیتوں کی قدر و قیمت اور معنویت نظر میں خوب رچ جاتی ہیں۔

—: (۲۹) —:

بزرگ آدمیت الکرسی اور اس کے بزرگ لمحات سے گزر کر اب آپ اس مقام پر آتے ہیں جہاں رئیس الموحدين حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا مکالمہ و مناظرہ اپنے ایک معاصر بادشاہ سے درج ذیل ہے :-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّہٖ اَنْ اَللّٰہُ
اَللّٰہُ الْمَلِکُ (آیت ۲۵۸)

(اے مخاطب) کیا تو نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کیا جو ابراہیم سے ان کے پروردگار کے باب میں مباحثہ کر بیٹھا اس (شعنی) میں اگر کراشر نے اسے بادشاہت دے رکھی تھی۔

قرآن مجید میں اس بادشاہ کا نام اور پتا نشان کچھ درج نہیں مفسرین نے اس کا نام فرود لکھا ہے، اور وہ بادشاہ بابل یا کلدانیہ کا تھا۔ حضرت ابراہیم کے زمانے کی تاریخ بہت دھندلی ہے۔ اس لیے بادشاہ کا صحیح نام اور پتہ اب تک تاریخ کے صفحات میں نہیں مل سکا ہے۔ تو یہ بات کچھ ایسے اچھیے کی نہیں۔ فرود ہی خدا معلوم اس کا اصلی نام تھا یا یہ صرف اس کا عربی تلفظ ہے۔ بہر حال اس نام کے ایک بادشاہ کا ذکر تورات میں دو جگہ آیا ہے۔ اور دونوں جگہ سخت ظالم کی حیثیت سے۔ ایک جگہ صحیفہ پیدائش کے باب ۱۰ کی آیت ۹ میں ہے۔

”..... سے فرود پیدا ہوا۔ وہ زمین پر تھار ہونے لگا اور خداوند کے

سامنے وہ تھار و جبار تھا“

اور دوسری جگہ صحیفہ ۱۔ تورات کے باب ۱ کی آیت ۱۰ میں ہے :-

”وہ زمین پر جبار ہونے لگا“

اور جیوش انسائیکلو پیڈیا میں روایات یہود کے حوالے سے ہے :-

”نمرد زمین کا بادشاہ ہو گیا، اور آذر کو اس نے اپنا وزیر بنایا، اس کے

بعد اپنی عظمت کے نشہ میں نمرد خدا سے بیگانہ ہو گیا۔ اور بہت سخت قسم کا

شرک ہو گیا“ (جلد 4 صفحہ ۳۰۹)

اور اتنی صراحت انسانیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ تھیکس میں ملتی ہے، کہ بابل کی تاریخ میں ایک بادشاہ کا نام آتا ہے، بابل کا سب سے پہلا انسانی خدا تھا۔ اور بعض مورخین نے اسے نمرد کا بڑا ثبت قرار دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اللّٰهُ الْمَلٰٓئِکَۃِ فِیْ اَنْ لَّا تَکُ مَعْنٰی فِیْ هٰۤیَۃِ۔ یعنی انشہ نے جو اسے بادشاہت سے سرفراز کر دیا تھا، یہی اسے کبر و پندار پر لے آیا۔ اور اسی نے اس میں سرکشی اور طغیانی پیدا کر دی۔

اَلَّذِیْ حَلَّجَ اِبْرٰهٖمَ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مباحثہ و مناظرہ شروع اسی نے کیا تھا کہ پیغمبر و قس نے۔

فِیْ رِبِّہٖ اسے ظاہر کر رہا ہے کہ گفتگو باب الوہیت میں نہ تھی، منکر و مشرک فرماں رواؤں کو ٹھوکر باب ربوبیت ہی میں لگی ہے۔ اپنے متعلق الوہیت کا دعویٰ تو شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ دعوائے سہی بھی بدیہی البطلان۔

حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں کلدانیوں کا مذہب اصلاً شمس پرستی کا۔ یعنی سولج دیوتا کی پوجا کا تھا دوسرے دیوی دیوتاؤں کا سردار ہی تھا۔ اسی کا منظر یا اوتار عجیب نہیں کہ نمرد کلدانی اپنے کو سمجھ رہا ہو۔ اور اہل توحید کو سرکاری مذہب کا دشمن و غدار اور ایسے خدا سے باطل کو اہل توحید سے علن اور بھینچلا ہٹ پیدا ہو جانا قدرتی تھا۔ یہود کے مؤرخ قدیم جوزیفوس کی تاریخ آثار یہود میں ذکر ہے:-

”لوگوں کی خوش حالی کو خدا کی جانب نسبت دینے سے روکنے لگا، گویا کہ وہ خود

قادر علی الاطلاق تھا، کہتا تھا کہ اگر اکی خدا نے طوفان نوح کی طرح دنیا کو ڈوبیا تو

جب کہ امیر ایم نے اس سے کہا کہ میرا خدا وہی ہے جو جلا تا اور مارتا ہے۔

آپ نے جواب میں فرمایا ہو گا کہ حیات و موت کی ساری قوتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں وہی ساری نظام ربوبیت کا سرچشمہ ہے، کائنات جاتی کی بقا و فنا کے سارے قانون اور ضابطے آخر میں اسی پر جا کر ٹھہرتے ہیں۔ کسی مستی میں بھی یہ طاقت نہیں کہ اس نظام بقائی و فنا کی کو بدل دے۔ یا اس میں کوئی ادنیٰ سا تصرف کر دکھائے۔

علم کلام جسے ہمارے غالی صوفیا بڑی حد تک حقارت سے دیکھتے ہیں، بلکہ
مشکلم کو گمراہ و بد دین سمجھتے ہیں تو آپ نے دیکھ لیا کہ اُسے بد دینی کے درجہ پر رکھنا کجا، اس کا
اثبات تو سنتِ انبیاء سے ہو رہا ہے!

قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ط

وہ بولا کہ نہ جھگڑی اور موت تو میں دیتا ہوں۔

بے دین کی عقل ہی کتنی ! موت و حیات کے اسباب بعید و خفی کو تو اس نے چھوڑا
صرف اسباب سطحی و قریبی کو سامنے رکھ کر بولا کہ سامان معیشت تو سب میرے ہاتھ میں ہے

جسے چاہوں زندہ رہنے دوں، اور جسے چاہوں بھوکوں مار ڈالوں۔ یا اور جس طرح چاہوں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔

ابراہیم ذی نے جب دیکھا کہ اتنی موٹی بات بھی مخاطب غبی کی سمجھ میں نہ آئی تو آپ نے ایک دوسرا پیرایہ اور زیادہ عام فہم اختیار کیا۔

قَالَ اِبْرَاهِيْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَأْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ
فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔

ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا مغرب سے نکال کر دکھا۔

مؤحد اعظم نے استدلال کو زیادہ قریب لے کر بنانے کے لئے یہ دوسری مثال جھٹ سے پیش کر دی، کہ تو سورج درو تاکا اور تار بنا پھرتا ہے۔ اور اسی درو تاکا کے قادر و تصرف ہونے کا ڈھنڈور چاہیے تو زیادہ نہیں تو ذرا اتنا ہی کر دکھا کہ سورج عام قانون الہی سے ہٹ کر کسی دن ذرا اُرخ اور سمت ہی بدل دے۔ دوسروں پر قدرت و تصرف رکھنا الگ رہا ذرا اپنے ہی اوپر تصرف کر کے دکھا دے۔ تصرف بھی صرف اتنا کہ اپنا رخ بجائے ادھر کے ادھر کر دے۔ آپ نے نفس استدلال وہی قائم رکھا، صرف مخاطب کی غیادت اور سطحی ذہنیت کا لحاظ کر کے گویا یہ کہہ دیا کہ اچھا کائنات جاتی میں نہ سہی، کائنات طبعی ہی کے نظام خلائی میں ایک ادنیٰ تصرف کر کے دکھا دے۔

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ۔ پس جو کافر تھا وہ بہوت ہو گیا۔

اس کا جواب کسی شرک و اُفتاب پرست کے پاس کیا ہو سکتا تھا۔ نہ اس وقت کسی سے جواب بن پڑا، نہ آج بھی کسی سے ممکن ہے۔ استدلال کا حاصل و خلاصہ یہ ہے کہ جس سہنی کے صاحب امداد و عظیم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ صاحب ارادہ و خفیت بھی ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن کسی ”خدا“ کے عاجز و لاجواب رہ جانے کا منظر اس سے بڑھ کر کیا پیش

ہوسکتا تھا۔

آیت کا تو قرآن کے عمومی اسلوب بیان کے مطابق اللہ کے ایک عام قانون کے بیان پر ہوا ہے۔

وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

اور اللہ راہ ہدایت نہیں دکھاتا ظالم لوگوں کو
اور ظالم لوگ کون ہوتے ہیں؟ وہی جو غلو ذہن کے ساتھ حقائق پر غور نہیں کرتے اور
حقیقت رسی کی کوشش ہی ذہن سلیم و مستقیم کے ساتھ نہیں کرتے۔ بلکہ ضد و عناد، تقلید
جامد و تعصب پر جمے رہتے ہیں۔ چنانچہ اب ظالم و فاجر خدا "باوجود لاجواب ہونے
کے ایمان نہ لایا اور اپنی بات کی تصحیح پر قائم رہا۔

بخش ۲۰: پنجہ

ختم رکوع سے کچھ قبل ایک حکایت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اور آئی ہے
اور مشکلات نفسِ سران کے سلسلے میں سننے کے قابل ہے، ایک دن آپ کو خیال یہ گزرا
کہ حشر اجساد کیوں کر واقع ہوا، مدتوں کے مرے اور گڑے ہوئے لاشے آخر کس طرح
جی اٹھیں گے۔ اور جب خیال آیا تو اپنے رب سے بھی سوال کر بیٹھے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ (آیت ۲۶۰)

(وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار (ذرا)
مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائے گا۔

سوال اس کا ہوا کہ کیا اس کا یقین نہیں؟

قَالَ أَوَلَمْ تَوُفِّئْنِي، ارشاد ہوا کہ تمہیں اس کا یقین نہیں؟

آپ تو خیر پچھلے یقین تو ہر عامی مومن کو ہوتا ہے، آپ کو کیسے نہ ہوتا! جواب میں

قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لَّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ — عرض کیا کہ ضرور ہے، لیکن یہ

درخواست اس لئے ہے کہ قلب کو (اور) اطمینان ہو جائے۔

یقین سے گزر کر درجہ اطمینان اور سکون کا حاصل کر لینا چاہتا ہوں اور علم یقین سے گزر کر مرتبہ عین یقین تک پہنچ جانا چاہتا ہوں، یقین کا جو مرتبہ تصدیق و ایمان کے لئے کافی ہے، وہ تو حاصل ہی ہے، اب اور اس سے بڑھ کر درجہ اطمینان و مشاہدہ کی طلب کے محققین عارفین نے کہا ہے کہ مقبولین کے مشاہدات سے ترقی ہی ان کے مراتب ایمان و کمالات ایقان میں ہوئی رہتی ہے، اور پھر اسی نسبت کے اضافہ ان کے تقرب، اعزاز، و قدر میں ہوتا رہتا ہے۔ اللہ کے ہونے والے غلیل میں طلب اور تڑپ اسی مرتبہ کی ہوئی تھی۔

قَالَ فَخُذْ أَدْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ۖ

ارشاد ہوا کہ اچھا چار پرندے لے اور انھیں اپنے سے خوب ہلا لے۔

آیت میں اہم ترین لفظ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ہے، لغت میں صَادَ يَصُورُ کا مفہوم اپنے سے خوب ہلا لینے اور مانوس کر لینے کا ہے، اور اہل تفسیر نے یہاں اتنا مضمون محذوف مانا ہے کہ اس کے بعد انھیں ذبح کر ڈالے اور آپس میں اس کا گوشت ملا لیجئے۔

شعرو محاضرات ادب بھی ایسے محذوفات سے نامانوس نہیں، اور قرآن خود بھی ایسے

محذوفات و مقدمات سے خالی نہیں۔ سورہ بقرہ کے ابتدائی ہی رکوعوں میں حضرت موسیٰ کو

حکم ملا ہے کہ چٹان پر اپنا عصا مارو (فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ) اور پھر

اس مضمون کو ظاہر کئے بغیر کہ آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور چٹان پر ضرب لگائی، یہ

بیان آگیا ہے۔ پس چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے (فَافْجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا

عَشْرَةَ عَيْنًا) اور ایسی مثالیں اور بھی بہت سی مل جاتی ہیں۔ بلکہ لغت و تفسیر کے بعض

اماموں نے تو یہ صاف لکھ دیا ہے کہ صَادَ يَصُورُ کے معنی خود ہی کاٹنے اور پارہ پارہ

کر ڈالنے کے ہیں۔ کسی حدت و تقدیر کے ماننے کی ضرورت ہی نہیں۔ بہر حال حدت مانا جائے تو، اور نہ مانا جائے تو اتنے جزو پر جمہور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں مراد یہی ہے کہ چاروں پہلے ہوئے پرندوں کو ذبح کر کے پارہ پارہ کر ڈالئے۔ بعض مفسروں نے ان چاروں پرندوں کو متعین کر کے ان کے نام بھی لکھ دیئے ہیں۔ لیکن اول تو یہ روایت ہی کوئی مضبوط سند نہیں رکھتی۔ پھر اس تعین کی ضرورت ہی کیا ہے۔ البتہ بعض صوفیاء نے اس روایت سے خوب کام نکالا ہے۔ اور ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ان چاروں پرندوں سے اشارہ ان کی چار قوتوں کی طرف نکلتا ہے۔ جو مشاہدہ حق اور حیاتِ حقانی سے مانع و حاجب ہوتے ہیں، اور جن کو قربان کئے بغیر انسان پاکیزگی کی منزل تک پہنچ نہیں سکتا۔ اور وہ چار نفسیاتی قوتیں یہ ہیں :-

(۱) خود بینی یا خود نمائی یا حُبِ جاہ

(۲) افراطِ شہوتِ جنسی

(۳) حرص و طمع یا حُبِ مال

(۴) طولِ آمل یا محبتِ دنیا

اچھا تو پرندوں کے اس گوشت کے مخلوط کو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیجئے۔

ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً

پھر ان میں کا ایک ایک حصہ پہاڑ پر رکھ دو۔

جُزْءَ کے مسئلے کو خوب سمجھ لیجئے۔ یہ مراد نہیں کہ چاروں کے مجموعہ کا ایک ایک

مسلم جزو یا ایک ایک پرندہ، بلکہ مجموعے یا مخلوط کے ملے جلے حصے۔

ثُمَّ اذْعُھُنَّ یَاٰتِیْنٰکَ سَعِیًا

پھر انھیں بلاؤ تو وہ تمھاری طرف دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔

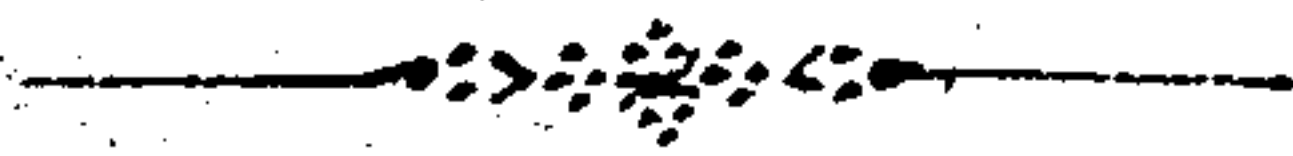
جب چند روز کے کھلانے پلانے اور اپنے سے ہلا لینے سے وہ اتنے مانوس

اور مطیع اپنے مجازی مالک کے ہو جاتے ہیں کہ اس کی ایک آواز پر دوڑے ہوئے
اس کے پاس چلے آتے ہیں، تو میری ہی پیدا کی ہوئی روحیں، میرے بلاوے پر
کیسی بے چون و چرا اور کسی بے خطا میرے پاس بھاگتی ہوئی نہ آجائیں گی۔ اور اس
کے ایک مشاہدے نے تمہارے دل کے اندر یہ حقیقت اتار دی ہوگی؟

وَأَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (آیت ۲۶۰)

اور اسے جانے رہو کہ اللہ زبردست ہے اور حکمت والا۔

آیت کا خاتمہ حسب معمول اس انمول پند پر ہوا ہے کہ اسے خوب جانے
بوسجھے رہو کہ اللہ تو ہر چیز پر یکساں غالب و قادر ہے و شوار اور محال اس کے
نزدیک کیا ہے۔ اشد و اہل اس کے لئے سب برابر۔ یہ تفریقیں تو انسان کے
اپنے معیار سے ہیں۔ اور باوجود اس عموم قدرت و اختیار مطلق کے وہ کرتا صرف
وہی ہے۔ جو عین اس کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہوتا ہے۔





تیسرا خطبہ

سورہ آل عمران میں سیدہ حضرت مریمؑ کا قصہ ذرا تفصیل سے آتا ہے اور توجہ سے سننے والا ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ
مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (آیت ۳۵)

وہ وقت یاد کرو جب عمران کی بیوی نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے نذر مانی ہے اس (بچہ کے لئے جو میرے پیٹ میں ہے) آزاد رکھا جائے گا، سو تو یہ مجھ سے قبول کر تو خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

عمران کے نام کی تاریخی شخصیتیں دو گزری ہیں۔ ایک حضرت موسیٰؑ کے والد ماجد عمران بن صہر، اور دوسرے ان سے صدیوں بعد حضرت مریمؑ کے والد ماجد حضرت عیسیٰؑ کے نانا۔ عمران بن ماثان / سیاق میں یہی مراد ہیں۔ امراۃ عمران یعنی انکی بیوی، ان کا نام سچی نوشتوں میں حنہ (Hannah) آیا ہے اور ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ شام وغیرہ میں سچی کلیسا، کلیسا ٹے حنہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور ان کی قبر شہر دمشق میں ہے۔

مَحْرُورًا یعنی ہر قسم کے دنیوی علائق سے آزاد رہے گا۔ اور تیری ہی خدمت اور چاکری کے لیے وقف رہے گا۔

جب سے آپ حاملہ تھیں اور اُمید فرزندِ نرینہ کی کر رہی تھیں تو آپ نے اس وقت یہ مناجات حق تعالیٰ سے کی تھی۔ ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کی خدمت کے لیے اولادِ مذکور کو نذر کرنے کا دستور اس وقت تھا۔ اور والدہ مریم نے اس دستور کے مطابق یرشلت مان لی تھی۔ اس دعا سے متعلق اور بھی تفصیلات قدیم ترین یہی نوشتوں میں موجود تھیں۔ لیکن جب آبائے کلیسا نے کاٹ پھانٹ کر کے "مُسْتَد" انجیلیں مرتب کرنا شروع کیں تو انھوں نے ایسے بہت سے بیانات کو حذف کر کے اپنی مُسْتَد کتابوں سے خارج کر دیا۔ اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے یہ سچی فاضل کہہ رہے ہیں۔ مثلاً کیتھولک ڈکشنری میں ص ۴۷ پر اور، میسنگر کی ڈکشنری آف ہی بائبل جلد ۲ کے ص ۲۸۸ پر۔

دُعا کے آخر میں ہے کہ تو تو خوب سُننے والا میری دعاؤں کا اور جاننے والا میری آرزوؤں کا ہے۔

لیکن ولادت جب ہوئی تو خلاف توقع بجائے لڑکے کے لڑکی کی، تو اب وہ بچاری چکر میں پڑ گئیں کہ اب کیا صورت نذر پوری کرنے اور منت اُتارنے کی ہو سکتی ہے؟

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی ؕ

پھر جب وہ لڑکی جنی تو یہ بولیں کہ اے میرے پروردگار میں نے تو لڑکی جنی۔ تو اے اشر میرے۔ اب کیا کروں اور اپنی نذر کیسے پوری کروں۔

اب اشر میاں کے دورانِ کلام میں بی بی حشر سے فرماتے ہیں:

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ وَلَیْسَ الذَّكَرُ کَالْاُنْثٰی ؕ

✓ اور اشر تو ان سے بڑھ کر جانتا تھا کہ انھوں نے کیا جنا ہے اور لڑکا

لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا تھا۔
یعنی اللہ نے تو خوب سمجھنے کے بعد ہی لڑکی عطا کی تھی۔ اور ماں غریب کو کیا خبر
ہو سکتی تھی کہ یہ لڑکی کس عظمت و منزلت کی ہوگی۔ اور پھر اس کے بطن سے پیدائش
کس سرزندگی کی ہوگی۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اب اسی دعا کا بقیہ سنئے :-
وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذَرِّيَّتَهَا
مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ (آیت ۳۶)
خیر میں نے تو اس کا نام مریم رکھ لیا ہے، اور میں اس کو اور اسکی اولاد کو
تیری پناہ میں شیطان رجیم سے دے رہی ہوں۔

مریم نام یہود میں چلا ہوا تھا۔ اور اس کے لفظی معنی سریانی زبان میں بلند کے
ہیں۔ (اقرب الموارد)۔

الفاظ دعا سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ والیوں کو کتنی فکر اپنی اولاد کے دینی و
اخلاقی تحفظ کی ہوتی ہے۔ اب قصہ اس کے بعد کا ملاحظہ ہو۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا
وَوَضَعَهَا وَكْرًا تَابًا

پھر ان کے پروردگار نے ان کو بوجہ احسن قبول کر لیا اور اس کو اچھا
نشوونما دیا اور اس کا سر پرست نہ کر لیا کو بنا دیا۔

یعنی اللہ نے والدہ مریم کی تذکر کو لڑکی کی شکل میں قبول کر لیا۔ اور یہ خدمت
ہیکل سلیمانی کی ساری تاریخ میں ایک نئی بات ہوئی۔ یہی نوشتوں کے بموجب حضرت
مریم بین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے چن لی گئیں اور بعد کے چھوٹے
بڑے سب خادم اس کمسن بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ تھے۔

اور آپ کا نشر و نما کیا جسمانی اور کیا اخلاقی و روحانی اعتبار سے ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ بالغ اور سیانی ہو گئیں۔

کَقَلَّهَا ذِكْرِيَا سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ یہ سارے انتظامات خدائی تھے، زکریا کی حیثیت صرف واسطہ کی تھی۔ حضرت زکریا اسلامی عقیدہ میں اللہ کے پیغمبر تھے، مسیحی نوشتوں میں ذکر والدہ مریم کا تو پھر آیا ہے مگر حضرت زکریا کے ذکر سے کبھی صحیفے تقریباً خاموش ہی ہیں۔ چاروں مستند انجیلوں میں نام صرف ایک بار آیا ہے۔ انجیل لوقا میں، وہ بھی پیغمبر کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صرف ایک بزرگ اور راست باز کاہن کی حیثیت سے۔

”یہودیہ کے بادشاہ ہیرودس کے زمانہ میں ایساہ کے فریق میں زکریا نام

ایک کاہن کا تھا۔“ (لوقا - ۱: ۵)

آپ رشتے میں حضرت مریم کی والدہ کے بہنوئی تھے۔ یعنی ان کی والدہ کی بہن کے شوہر حضرت مریم کے والد جناب عمران کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ اور ان کی وفات کے بعد ہیکل کے خادموں یا مجاوروں کی سرداری انھیں حضرت زکریا کے حصہ میں آئی تھی جہت مریم کی تربیت کا واسطہ بھی اللہ نے آپ ہی کو بنایا۔ حضرت یحییٰ آپ ہی کے فرزند تھے۔ جو حضرت عیسیٰ کے ہم سن تھے مگر آپ کی تاریخ وفات کہیں نظر سے نہیں گزری۔ آپ کے زمانہ کا بس اندازہ ہی ان حسابوں سے کیا جاسکتا ہے۔

حضرت سلیمان ہی کی طرح حضرت مریم اور حضرت زکریا بھی ایسی دو شخصیتیں ہیں جن کی عظمت و شرف قائم رکھنے کا اہتمام قرآن ہی نے اسرائیلی تاریخ اور مسیحی نوشتوں اور عقیدوں سے کہیں زیادہ کیا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ

عِنْدَهَا رِزْقًا۔

جب جب ذکر یا ان کے پاس حجرے میں آتے تو ان کے پاس کوئی چیز کھانے پینے کی پاتے۔

محراب عربی میں، اُردو کی محراب سے الگ، حجرے کو کہتے ہیں۔ جہاں کوئی رب کے الگ تھلگ ہو کر بیٹھے اور ہیکل سلیمانی کے خادموں کے رہنے اور عبادت کرنے کے لئے ہیکل کے ادھر ادھر زاویے اور حجرے بنے ہوئے تھے۔ انہیں میں سے ایک حجرہ حضرت بی بی مریم کا تھا۔ حضرت زکریا یوں بھی سردار خدام تھے۔ اور ہر خادم کی نگرانی آپ کے فرائض میں شامل، اور آپ پھر اس نو عمر خادمہ کے تو عزیز قریب اور بزرگ سرپرست بھی تھے۔ حجرہ مریم میں قدرتِ آپ کی آمد و رفت رہا کرتی۔ کُلَّمَا قرآن مجید کے اس ذرا سے لفظ نے اس سارے مفہوم یعنی آپ کی کثرت آمد و رفت، اور وقت بے وقت آمد، سب کی طرف اشارہ کر دیا۔ دِ ذِ قَا سے مراد کھانے پینے کا سامان ہے۔ مثلاً ترمذی تازہ پھل اور میوے۔ اور امام رازی نے لکھا ہے کہ لفظ کی تہذیب سے تعظیم نکلتی ہے، یعنی وہ رزق جو کوئی عجیب و غریب پہلو رکھتا تھا۔ بعض قدیم حدیث پسندوں نے رزق کو استعارہ قرار دے کر اس سے مراد فیض کی ہے۔ اس پر ابو جہان غرناطی صاحب البحر المحیط نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر کے حدود سے تجاوز کر کے باطنیہ کی زبان اختیار کر لینا ہے۔

یہ طور حبلہ معترضہ یہ بھی سن رکھئے کہ بی بی مریم چونکہ نبیہ تھیں، محض ولی تھیں جسے امامیہ کو بھی اہل سنت کے ساتھ اتفاق ہے۔ اس لئے اس آیت سے محققین نے اثبات کرامت و خرق عادت پر استناد کیا ہے۔ حضرت زکریا کو اس پر حیرت سے بڑا بالکل قدرتی تھی اور ہمیشہ تک کے لئے ضروری نہیں کہ ہر معاملہ میں اپنی نظر کو اسباب ظاہر کے باہر دوڑائے۔

آپ حیرت سے سوال کر بیٹھے :-

قَالَ يَمْرَيْمُ أَنِّي لَكَ هَذَا ۝

پوچھ بیٹھے کہ اے مریم یہ (سب) تجھے کہاں سے مل جاتا ہے؟

لاتا تو میں ہی لاتا۔ میرے سوا کون یہ چیزیں پہنچا دیتا ہے؟

قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۝ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ

بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (آیت ۳۷)

بولیں کہ یہ اللہ کی طرف سے (آجاتے ہیں) اور بیشک اللہ جس کو چاہے

اسے رزق بے حساب دے دیتا ہے۔

عارفانہ کی نظر اسباب پر نہیں۔ مُسَبَّبُ الاسباب پر تھی ہوا اس نے وہی جواب میں کہہ دیا اور اس پر اضافہ بھی اس نکتہ عارفانہ کا کہ دیا کہ اللہ کی مشیت کسی واسطہ اور کسی حق و استحقاق کے ساتھ مقید نہیں۔ وہ جب کسی کو دینے پر آئے تو بلا واسطہ اسباب بھی دے سکتا ہے اور بلا استحقاق بھی۔

ضمنیٰ اس میں ردِ مکمل آیا ان مشرک قوموں کا جنہوں نے خوش حالی اور تنگ حالی کو لازمی نتیجہ قرار دیا ہے پچھلے جنم کے اعمال کا۔ اسلام کا خدا جس طرح اپنی مشیت کو نبی کے ہر جُز و میں آزاد ہے۔ اسی طرح تقسیم رزق میں بھی۔

آگے سنئے :-

هٰذَا لَكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۝

بس وہیں زکریا اپنے رب سے دعا کرنے لگے۔

قدرت و رحمت الہی کے تازہ کرشموں سے حضرت زکریا کا تاثر قدرتی تھا۔

ہُنَا ظَنُّ مَكَانٍ، ظنّ زمان کے معنی میں آیا ہے۔ اس لئے دوسرا ترجمہ بجائے ”وہیں“ کے ”معا“ بھی ہو سکتا ہے۔ غرض جوں ہی آپ پر منکشف ہوا کہ یہ مقام قبولیت کا، اور خرق عادت کے صدور کا ہے، آپ خود بھی مصروف دعا ہو گئے۔

قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً
إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ (آیت ۳۸)

عرض کی کہ اے میرے پروردگار اپنے پاس سے ایک پاکیزہ اولاد دے
بے شک تو دعا کا بڑا سننے والا ہے۔

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً یعنی اولاد پاکیزہ جو میرے سلسلہٴ روحانی کو آگے چلا سکے۔
مجھے بھی اولاد عساکح اسی طرح عنایت ہو جس طرح والدہ مریم کو مریم عنایت ہو چکی ہیں،
حضرت زکریا کبر سنی کو پہنچ چکے تھے، اور بیوی صاحبہ بھی عقیقہ یا بانجھ سمجھ لی گئی تھیں۔
ایک خارق عادت واقعہ کو دیکھ، آپ کا ذہن قدر نما اس طرف منتقل ہوا کہ جو خدا اس پر
قادر ہے کہ بلا اسباب ظاہری تردد تازہ پھل پھلاری پہنچا دے، وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے
کہ اس سن میں مجھے نعمت اولاد سے نوازا کر دے۔

مِنْ لَدُنْكَ یہ جزو اسے صاف کر رہا ہے کہ دعا مانگنے والے کی نظر اس
دنیا میں بھی اسباب سے بڑھ کر خالق اسباب پر ہے۔

قدر نما اولاد کی خواہش امر طبعی ہے اور زہد کیا معنی کمال زہد کے بھی منافی نہیں۔
قرآن مجید نے اس قسم کی دعائیں پیبروں کی زبان سے ادا کرا کے یہ بتا دیا کہ جن مذہبوں
بیوی بچوں کو مطلق صورت میں جنجال قرار دیا ہے، وہ حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔ طلب
اولاد کی دعا تو سنت اسباب و صدقین ہے، اور صحیح بخاری میں ایک مستقل باب طلب
اولاد کے فضائل میں ہے۔

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً کے اضافہ نے صاف کر دیا کہ اہل اللہ کی نظر آخرت پر
بہر حال رہتی ہے۔ کوئی مضائقہ اولاد کی مطلق خواہش میں بھی نہ تھا، لیکن حضرت زکریا
اپنے لئے محض اولاد ہی نہیں چاہتے، اولاد طیب و پاکیزہ چاہتے ہیں جو ان کے بعد
دین حق کی تبلیغ کا مشن جاری رکھے، اللہ والوں کی نگاہ میں اخلاقی و روحانی

فضائل بہر حال مقدم رہتے ہیں۔ انجیل میں بجائے اس دلاویز، موثر، راجح پروردگار کی تفصیل کے قناعت صرف اس خشک مختصر واقعاتی بیان پر کی گئی ہے۔

”زکریا کا نام کا ایک کاہن تھا، اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام ایشیع تھا اور ان کے اولاد نہ تھی، اس لئے کہ ایشیع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے“ (لوقا۔ ۱: ۵-۷)

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الدَّاعِیُّ تو دعاؤں کا بڑا سننے والا اور بڑا قبول کرنے والا ہے۔ حق تعالیٰ کی اس صفت کو بار بار بیان میں لانا ان مادی اور نیچری عقیدہ دلوں کے رد میں ہے، جو واقعات کو تمام تر اسباب ظاہری و مادی ہی کا نتیجہ سمجھتے اور ارادہ حق تعالیٰ کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔ دعا مٹا قبول ہو گئی اور حالت نماز ہی میں فرزند کی بشارت مل گئی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ (آیت ۳۹)

انہیں فرشتوں نے آواز دی اور وہ ابھی نماز حجرہ میں کھڑے ہوئے پڑھ رہے تھے کہ انہیں تم کو یحییٰ کو خوشخبری دیتا ہے۔

الْمَلَائِكَةُ کا صیغہ جمع کھٹک نہیں دے۔ یہ لازمی نہیں کہ آواز دینے والے فرشتے متعدد ہوں۔ عربی میں صیغہ جمع اسم جنس کا بھی کام دیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ملائکہ سے مراد صرف جنس ملائکہ ہی ہو اور عربی میں یہ محاورہ عام ہے۔ فَلَانَ بِرُكْبِ الْحَيْلِ (فلان شخص گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے) حالانکہ وہاں مراد گھوڑے کی جنس ہوتی ہے نہ کہ ان کا تعدد۔

✓ یحییٰ۔ فرزند کی صرف بشارت ہی نہیں ملی، بلکہ نام بھی عطا ہو گیا۔ انجیل میں تلفظ یوحنا آیا ہے۔ اس خاص موقع پر عبارت ہے :-

”فرشتے نے اس سے کہا اے ذکر یا خوف نہ کر، کیونکہ تیری دعا سنی گئی۔

اور تیری بیوی ایلیشع تیرے لئے بیٹا بنے گی، اس کا نام یوحنا رکھنا، اور تجھے

خوشی و خرمی ہوگی“ (لوقا۔ ۱: ۱۲)

حضرت عیسیٰ کے خالہ زاد بھائی تھے، انہوں نے حسب روایت انجیل، ان سے سن میں صرف چھ مہینے بڑے، ۳۰ء میں حاکم شام فلسطین ہیرود کے حکم سے شہید کر دئے گئے۔ یحییٰ کا صرف نام ہی نہیں عنایت ہوا۔ بلکہ کچھ اوصاف کی بھی پیش خبری دی گئی۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُودًا

وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ (آیت ۳۹)

کلمہ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدا اور بڑے نفس کے ضبط

کرنے والے اور نبی صالحین میں سے۔

ان الفاظ کو خوب سمجھ لیجئے۔ جس طرح روح القدس ایک لقب حضرت جبریل کا ہے

کَلِمَةً مِّنَ اللَّهِ سے مراد حضرت مسیح ہیں۔ ابن عباس صحابی اور متعدد جلیل القدر

تابعین سے یہی منقول ہے۔ یعنی تصدیق حضرت عیسیٰ کی کرنے والے۔ اور مسیحی عقیدہ میں

حضرت یحییٰ کی اصل حیثیت مسیح کے نقیب ہی کی ہے۔

سَيِّدًا یعنی دین کے باب میں مقتدا اور پیشوا۔ عیسائی تو خیر آپ کی بزرگی کے

قائل ہی ہیں۔ یہودی بھی باوجود آپ سے بدعقیدگی اور دشمنی کے، آپ کی مرجعیت اور

مقبولیت کے منکر نہیں۔

حَصُودًا یعنی اسے اپنے شہوات اور جذبات پر قابو حاصل ہوگا اور وہ نہایت

درجہ محتاط و متقی ہوگا۔ انجیل میں آپ کے زہد و عفاف کا ذکر مختلف موقعوں پر صراحتاً

تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً

”خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا، ہرگز نہ وہ نے اور نہ کوئی اور شراب

پئے گا۔ اور اپنی ماں کے پٹ ہی سے وہ روح القدس سے بھر جائے گا (لوقا۔ او ۱۶) اور اسی انجیل لوقا میں آگے چل کر ہے :-

”اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لیے ایک مستعد قوم تیار کرے۔“ (لوقا۔ ۱: ۱۷، ۱۸)

اور پراسی لوقا میں ہے:

”اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا، اور اسرائیل پر ظاہر ہونے تک جنگلوں میں رہا۔“ (لوقا۔ ۱: ۸)

نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ یہ ذرا سا فقرہ دو چیزوں کا اثبات کرتا ہے: ایک آپ کی نبوت کا، یہ دوسرے یہود کا جو آپ کو بجائے نبی کے ایک بنا ہوا انقلابی سمجھتے تھے۔ دوسرا آپ کی صاحبیت کا اثبات، نصرائیوں کے مقابلہ میں ہے۔ صاحبیت تو نبوت سے ملکی اور پست چیز ہے۔ اور جب کوئی نبی ہے تو آپ کہیں گے کہ ظاہر ہے کہ وہ صالح تو ہو گا ہی۔ لیکن یہ ظاہر کہاں ہے؟ یہ تو صرف اسلام کی تعلیم ہے، اسلام ہی نے آکر یہ سبق سکھایا، ورنہ اہل کتاب کے ہاں تو تقویٰ لازمہ نبوت تھا ہی نہیں۔ اور نبی کوئی غیر صالح بھی ہو سکتا تھا۔ حضرت زکریا کو بشارت تو بیٹے کی مل گئی اور اپنی دعا کی بھرپور مقبولیت پر آپ کو جیسی مسرت ہوئی ہو گی، ظاہر ہے، پھر بھی آپ بشر ہی تھے اور بشریت کے تقاضے سے حیرت میں بھی تھے کہ قدرت کے معمولات عام سے اس قدر ہٹ کر کوئی واقعہ واقع ہو گا کیونکر۔ یہ شبہ بھی بے تکلف جناب باری میں پیش کر دیا۔

قَالَ رَبِّ اِنَّیْ یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِی الْکِبَرُ
وَ اَمْرَ اَتِیْ عَاقِرٌ

عرض کی کہ اے میرے پروردگار میرے بیٹے کس طرح ہوگا۔ اس حال میں کہ مجھے کبر سنی نے آیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔
آیت یہ تعلیم بھی دے رہی ہے کہ خلاف اسباب ماوی کسی شے کی خبر وقوع پر حیرت جس طرح ہر بشر کے لئے ایک امر طبعی ہے، خود سمیر بھی امور طبعی میں بالکل بشری ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے بھی بالکل جائز ہے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ كَذَلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۝

اللہ اسی طرح کر دیتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے۔
رفع استبعاد کے لئے بس استحضار قدرت الہی کا یہ مراقبہ بالکل کافی ہے اور سمیر کو اس استحضار کے لئے ایک اشارہ کافی ہو گیا۔ اب عرض کی کہ اس کے لئے کوئی خاص نشان بھی ارشاد ہو جائے۔

قَالَ حَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۝ (آیت ۴۱)

برائے اے پروردگار میرے لئے کوئی نشان مقرر کر دے۔
یعنی کوئی ایسی علامت انجام دے کہ میں ظاہر ہو جائے جس سے متعین طور پر مجھے یقین ہو جائے کہ حل قرار پا گیا اور زمانہ ولادت اب قریب ہے۔

قَالَ الْيُنَاكَ إِلَّا نُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا دَمْرًا ۝

وَإِذْ كَرَّمْنَاكَ كَثِيرًا وَنَسِجَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۝ (آیت ۴۲)

ارشاد ہوا کہ نشانی تمہارے لئے یہ ہے کہ تم بات چیت تو نہ کر سکو گے لوگوں سے

تین دن تک بجز اشارات کے، باقی اپنے پروردگار کو بہ کثرت یاد کرتے

رہو اور اس کی تسبیح بھی دن میں بھی اور شام میں بھی۔

یعنی وہ نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تم لوگوں سے بات چیت تو نہ کر سکو گے باقی اپنے پروردگار

کی یاد خوب کرتے رہو۔ اور اسکی تسبیح بھی صبح و شام کرتے رہو۔ اور محاورہ زبان میں اسکی انھیں درد و قوتوں کی تعین اور حصر مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ دوام ذکر و تسبیح ہی مراد ہوتا ہے۔ قرآن مجید جو تمام آسمانی صحیفوں پر ہمیں یعنی نگران و نگہبان ہے۔ اسکا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ ان غلطیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا جائے۔ اس نے اپنا فرض یہاں بھی انجام دیا۔ ورنہ انھیل کے بیان سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑی لغزش و معصیت حضرت سر زکریا سے سرزد ہو گئی تھی۔ اور اس کی سزایہ ملی تھی کہ چند روز کے لئے آپ کی قوت گویائی سلب کر لی گئی تھی۔ چنانچہ انجیل کی عبارت اس موقع پر ہے :-

”اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہوئیں تو چپکالے گا اور بول نہ سکے گا

اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہموں کی یقین نہ کیا۔

جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ بس انھوں نے معلوم کر لیا کہ اس نے

مقدس روایہ دیکھا ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا بنا رہا (لوقا: ۱۸)

غرض یہ کہ یہ تین دن کی خاموشی بہ طور سزا یا عذاب کے تھی۔ ہرگز صحیح نہیں۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ بلکہ گفتگو اس میں البتہ حل سکتی ہے کہ یہ سہ روزہ خاموشی آیا تا مگر اضطرابی تھی یا اختیاری۔ یہ مجبور مفسرین کے اتباع میں ہے جو کہ آیت کے ترجمہ میں ابھی یہ غرض کیا گیا ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کر سکو گے، ورنہ الفاظ الَّا تَكَلَّمُ النَّاسُ کا صاف سیدھا اور بے تکلف ترجمہ تو یہ ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کرو گے (نہ کر سکو گے) مفسرین میں خال خال کوئی اس طرف بھی گیا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں اس کو ابو مسلم معتزلی کے حوالے سے نقل کیا ہے اور خود اس کی کوئی تردید نہیں کی ہے۔

گویا حکم الہی یہ مل رہا ہے کہ ذکر یا تم تین دن تک گفتگو میں زبان بند رکھنا۔ ہاں ذکر الہی و تسبیح کثرت سے کئے جانا الَّا تَكَلَّمُ النَّاسُ میں الناس گویا فقرے کی جان ہے۔ یعنی خلق پر گفتگو کی قدرت نہ رہے۔ باقی ذکر الہی کے لئے زبان بدستور چلتی رہے گی۔

—: ۳۲ :—

حضرت زکریا کا تذکرہ درمیان میں آجانے کے بعد اب پھر ذکر مریم شروع ہوتا ہے
 وَاذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ
 وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ (آیت ۴۲)
 اور وہ وقت یاد کرو جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم اللہ نے آپ کو برگزیدہ
 کیا ہے اور پاک کیا ہے اور آپ کو دنیا جہاں کے مقابل میں برگزیدہ کیا ہے
 مَلٰٓئِكَةُ کے صیغہ جمع سے، جیسا ابھی چند منٹ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہ لازم
 نہیں آتا کہ کتنے والے کئی فرشتے ہوں، صیغہ جمع اسم جنس کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے۔ یہی
 فرشتوں کی ہم کلامی کسی غیر بنی سے، تو وہ تو ثابت اس آیت سے ہو جاتی ہے البتہ محققین
 نے لکھا ہے کہ فرشتے کا اللہ کی طرف سے پیام تبلیغ صرف بنی کے ساتھ مخصوص ہے۔
 اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ اس اصطفا کا تعلق مریم کے بچپن سے ہے۔ یعنی اللہ
 نے برگزیدگی تو آپ کو شروع ہی سے دے رکھی ہے۔ آپ وجود میں آئیں تو اپنی
 والدہ کی مقبول دعاؤں کے اثر سے۔ پھر آپ سے کام سیکل کی خدمت کا لیا گیا۔ جو
 اب تک مخصوص رہا تھا مردوں اور لڑکوں کے ساتھ، اور آپ کو آپ کے حجرے میں
 غذائیں جس عجازی رنگ میں پہنچائی گئیں اس نے زکریا یا یمین تک کو متحیر کر دیا۔ یہ سب
 مثالیں آپ کی مقبولیت ہی کی تو ہیں۔

وَطَهَّرَكِ یعنی اللہ نے آپ کو بنی نہ ہونے کے باوجود گناہوں کی آلائش سے
 پاک کر دیا ہے اور آپ کو اخلاقی پاکیزگی کا ایک نمونہ بنا دیا ہے۔ یہ سب رد
 میں ہے یہود کے جو گندے الزامات آپ پر لگانے کے مرتکب ہوئے تھے +

وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ ہ اس دوسرے اصطفا کا تعلق

آپ کے بلوغ کے بعد سے ہے۔ اور پیدائش کے بعد یہ دوسری برگزیدگی خاص خاص حیثیتوں سے ہے۔

اور ان آیتوں کے بعد پھر وہی مضمون شروع ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَمْرُؤُا إِنَّ اللَّهَ يَبْشُرُكَ
بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ
مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ (آیت ۲۵)

س اور وہ وقت یاد کرو جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ آپ کو خوشخبری دیتا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی۔ ان کا نام و لقب مسیح ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں مقربوں میں سے۔

مسیح عیسیٰ کے سر ذکر میں یہود و عیسائیوں دونوں کے آدکس خوبی کے ساتھ ساتھ نکلتے آتے ہیں۔ ابن مریم کہہ کر قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کر دی کہ حضرت عیسیٰ خود تو بشر تھے ہی۔ فرزند بھی کسی دیوی دیوتا، کسی مافوق البشر کے نہ تھے، محض ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ اور اس ابن مریم سے اشارہ اس طرف ہو گیا کہ دنیا کے عام دستور کے خلاف حضرت عیسیٰ کا انتساب بجائے باپ کے ماں کی جانب ہو گیا۔ اور اس سے کچھ نہ کچھ روشنی آپ کی خرق عادت ولادت پر بھی پڑ گئی۔

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، یہ بات یہود کے رد میں ہے کہ تم نے جس کے حق میں ہر طرح کی توہین روارکھی ہے وہ کتنی عزت و اکرام والا ہے۔ دنیا کا اعزاز اس سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کے غالبانہ عقیدے کو چھوڑ کر خود مسلمان جو دنیا میں بہت کم کوئی کی تعداد میں ہیں ان کو اپنا ایک سردار اور اللہ کا پیغمبر برحق مان رہے ہیں اور ان کا نام بغیر علیہ السلام کے نہیں لیتے اور خود یہ بھی کچھ کم نہیں کہ اب یہود تک کے لہجہ میں نرمی آگئی ہے۔ اور صدیوں کی عداوت و عناد کے بعد اب کسی درجہ میں ان کے اجلال و اکرام کا اثر

انہیں بھی کرنا پڑ گیا ہے۔

مِنَ الْمُقَرَّبِينَ۔ ایک لفظ میں یہود اور نصراہوں دونوں کا ردِ کل آیا
پس لاؤ نصراہیت کا یعنی وہ اشر کے مقرب اور برگزیدہ بندے ہیں نہ کہ خود خدا۔
دوسرا رد یہود کا کہ وہ کوئی شعبہ باز یا ساحر نہ تھے۔ مِّنَ الْمُقَرَّبِينَ کی ترکیب یہ ظاہر
کئے دیتی ہے کہ وہ مقبولیت میں منفرد نہیں بلکہ ایک جماعت ان کے شریک ہے۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ ذِكْهُلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝ (آیت ۲۶)

اور گفتگو کریں گے لوگوں سے گوارے میں بھی اور سچتہ عمر میں بھی اور صالحین

میں سے ہوں گے۔ ۱۔

فِي الْمَهْدِ مراد کم عمری کا سن ہے، مفسرین نے آپ کے بچپن کا زمانہ مراد لیا ہے۔
بچپن ہی سے آپ کی باتیں قصہ کہانی کی نہیں بلکہ حکمت دینی و روحانی کی ہوتی تھیں انجیل
لوقا کے باب ۴ میں متعدد قولِ حکمت و دانائی کے آپ کی زبان سے نکلے ہوئے جمع کر دیے
ہیں۔ جو آپ سے بارہ سال کی عمر میں صادر ہوئے تھے۔ اور ذِکْهُلًا سے مراد ہے سچتہ عمری۔
یعنی نوجوانی کے بعد اور بڑھاپے سے قبل کا سن۔ مثلاً تیس سال سے لے کر پچاس سال کی
عمر۔ مقصد یہ ہے کہ آپ میں جوش تبلیغ شروع سے آخر تک برابر بھرا رہا۔ اور عمر کے گزرنے
کے ذکر میں اشارہ آپ کی الہیت کی رد کا بھی نکل آیا۔ یعنی آپ کا جسمانی نشوونما اسی طرح ہوتا
رہا۔ جیسے ہر انسان کا ہوتا ہے۔

وَمِنَ الصَّالِحِينَ جب آپ سچے تھے تو اسلامی نقطہ نظر سے مہربانی بات ہے کہ

صالح کیسے نہ ہوتے۔ لیکن قرآن کا مقصود یہاں بھی اپنے معمول کے مطابق یہودیت و
نصراہیت کا دو طرفہ رد رکھا ہے۔ یہود کو اس نے یہ بتایا کہ آپ نعوذ باشر شعبہ باز
یسا حرنہ تھے، جیسا کہ انہوں نے افتراء کر رکھا ہے۔ اور دوسری طرف نصراہوں کو یہ بتایا
ہے کہ وہ یہود یا نیم یہود نہ تھے۔

آپ بہر حال دوسرے انبیاء صالحین کی طرح بشر تھے نہ کہ فوق البشر اداوتا۔
جب فرشتہ کی یہ صدائے غیب حضرت مریم کے کان میں پڑی تو آپ نے حیرت
کے ساتھ اپنے پروردگار سے مناجات کی :-

قَالَتْ رَبِّ اَنۡیَ یَکُونُ لِیْ وَلَدٌ وَلَدْتُ لَکُمۡ بِمَسْنٰی بَشَرًا

بولیں اے میرے پروردگار میرے اولاد کس طرح ہوگی اور اں حالیکہ مجھے کسی
مرد نے (بغرض مواصلت) ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔

حسب روایت انجیل حضرت مریم کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی اور قبل رخصتی خلوت
یہود کے قانون مروج میں بالکل ممنوع تھی۔

قَالَتْ رَبِّ "رَبِّ" بہ ظاہر بالکل معمولی اور ناقابل التفات سلفظ ہے لیکن
انجیل میں یہی مقام کھول کر دیکھ لیجئے، لکھا ہے کہ :-

"ہم نے فرشتہ سے کہا" (لوقا - ۱ : ۳۴) اس ذرا سے فرق سے واضح
ہو جاتا ہے کہ قرآن نے آپ کا مرتبہ معرفت تو حید کس درجہ اونچا کر دیا ہے !

اَنۡیَ یَکُونُ لِیْ وَلَدٌ - سوال ظاہر ہے کہ واقعہ کی حیرت انگیزی اور
غریب کی بنا پر تھا نہ کہ کسی شک و انکار کی بنا پر۔

فرشتہ سے یہ دو بہ دو گفتگو سن لینے کے بعد انکار کا کوئی محل ہی باقی نہیں رہا
تھا۔ استبعادا البتہ باقی تھا، جو لازمہ بشریت تھا۔ اور حضرت زکریا کی جو حکایت بشارت
فرزند کے وقت کی بیان ہو چکی۔ اس سے یہ حکایت کتنی ملتی ہوئی ہے
جواب بھی اسی رنگ کا ارشاد ہوا۔

قَالَ کَذٰلِکَ اَللّٰهُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا

یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فِیْکُوْنُ ۝ (آیت ۴۰)

فرمایا ایسے ہی اللہ پیدا کر دیتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے، وہ جب کسی بات کو

پورا کرنا چاہتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے ہو جاؤ۔ بس اور وہ ہو جاتی ہے۔
رفع استبعاد کے لئے حضرت مریم کو یاد دلایا گیا کہ فاعل حقیقی تو ہماری مشیت اور ہمارا
امادہ ہے، نہ کہ اسباب طبعی و مادی و عادی، کہ وہ تو سب کے سب بس درجہ واسطہ و وسیلہ
میں ہیں۔ تو نظر صرف ہم ہی پر رکھو۔

یاد کر لیجئے کہ ایسے ہی موقع پر حضرت زکریا سے جو فرمایا گیا تھا۔ اس کے الفاظ تھے۔
كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ، وہاں يَفْعَلُ اور یہاں يَخْلُقُ کا استعمال کیا محض اتفاقی
ہے؟ جواب میں دو بار ایک میں مفسروں، ایک ابو حیان غرناطی صاحب البحر المحيط اور دوسرے
صاحب روح المعانی آلوسی بغدادی نے لکھا ہے کہ حضرت زکریا کی اولاد کے معاملہ میں معاملہ
کچھ ایسا غیر معمولی نہیں ہو رہا تھا، ولادت عام سنت الہی کے مطابق، یعنی مرد و زن کے
اتصال سے ہو رہی تھی۔ دونوں صرف سن سے اترے ہوئے تھے۔ اس ندرت کے
اظہار کے لئے يَفْعَلُ بالکل کافی ہو گیا۔ یہاں حضرت مریم کے معاملہ میں عام و جاری سنت
الہی سے ہٹ کر بغیر مرد و عورت کے اتصال کے صرف عورت ہی سے ولادت کا تحقق
کرانا تھا۔ اس لئے یہاں اس کی صفت تخلیق لائی گئی، جو اللہ کی قدرت ایجاد و ابداع پر صاف
دلالت کر رہی ہے۔

اور انھیں مطالب کہ شیخ رشید رضا مصری صاحب المنار نے اور زیادہ بسط و تفصیل سے
بیان کیا ہے۔

إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ جب وہ کسی چیز کو پیدا
کرنا چاہتا ہے تو بس ادھر اس سے کہا کہ ہو جاؤ اور ادھر وہ ہو گئی۔ اللہ کی کسی سامان کا محتاج
ہے۔ اس قسم کی آیتیں برابر ان فلسفیوں اور باطل مذہبوں کے رد میں ہیں۔ جو قدیم کو حادث
قیاس کر کے قدیم کو بھی سلسلہ اسباب کا پابند سمجھے ہوئے ہیں۔

لَٰكِنَّا هِنْدُوستان کے ایک بے مغز غیر مسلم مذہبی لیڈر نے ایک سوال یہ اٹھایا تھا

کہ جب کوئی شے موجود ہی نہیں ہے تو یہ کہا کس سے جاتا ہے؟ اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ علم الہی میں تو موجود ہوتی ہی ہے۔ پس اسی کو حکم ملتا ہے کہ عالم عنصری میں بھی موجود ہو جائے اور قول لکھ سے بھی مراد اس دوسری لفظ کا تلفظ نہیں اس لئے کہ یہ حروف تو خود ہی حادث ہیں۔ مراد اللہ تعالیٰ کا قول اس کیفیت کے ساتھ ہے، جو اس کی شان کمال کے لائق ہے اور اور جس طرح اس کی دوسری تمام صفات کی تفصیلات اور اک بشری کی گرفت سے باہر ہیں۔ اس کے اس قول کی بھی کیفیت تفصیل کے ساتھ نہیں سمجھائی جاسکتی۔ مراد صرف یہ ہے کہ ارادہ الہی اور اس کی تمیل کے درمیان کوئی بھی شے حائل یا حاجب نہیں بن سکتی۔

لہذا چوڑا جملہ معترضہ ختم ہوا۔ اب پھر اصل موضوع پر آئیے اور وہ مولود جو جناب مریم کو عنایت ہوگا، وہ ہوگا کس صفت کا؟

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ (آیت)

— اسرار سے سکھادے گا کتاب اور حکمت اور تورات و انجیل۔

ان کلمات سے حضرت مسیح کے جس مقام عظمت کا اظہار مقصود ہے، وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن خود حضرت مریم کی بھی تشفی خاطر کا کتنا سامان ہوا جا رہا ہے! ارشاد گویا یہ ہوا جا رہا ہے کہ تم غلگین و پریشان نہ ہو، بے شوہری اولاد کی بنا پر خلق تمہیں جتنا بھی مطعون و رہوا کرے گی اس کی تلافی کے لئے اولاد بھی تمہیں کس پایہ کی عطا ہو رہی ہے؟

الْكِتَابَ، یہ طور اسم جنس تمام آسمانی کتابوں کے لئے آیا ہے اور الْحِكْمَةُ سے مراد تمام دینی علوم و معارف ہیں جو پیغمبر صاحب کتاب کو علاوہ اس کی مخصوص کتاب کے اس کی شرح و تہم کے طور پر عطا ہوتے ہیں۔ اور ابھی آگے سنئے:

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ۔ اور وہ پیغمبر ہوگا بنی اسرائیل کے لئے۔

آپ کا صحیح اور اصلی مرتبہ پیغمبر کا ہوگا نہ کہ آپ نعوذ باللہ ساحر و شعبدہ باز ہوں گے۔

جیسا کہ یہود نے گڑھ لیا ہے۔ اور نہ خدا یا فرزند خدا، جیسا کہ نصرائیوں نے فرض کر لیا اور

ہر پیمبر جس طرح اس وقت تک اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوتا رہا تھا، آپ بھی اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوں گے۔ اور آگے آپ کی زندگی کا مشن اور آپ کے فضائل و کمالات آپ ہی کی زبان سے بیان کر دیے ہیں۔

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِنْ رَّبِّکُمْ اِنِّیْ اَخْلَقْتُ لَکُمْ مِنَ الطَّیْنِ کَهَشَّةَ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَبِکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْبَلُوْنَ دَمَانْدَ خُرُوْنِ فِیْ یَّوْمِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّوْمِنِیْنَ ؕ (آیت ۴۸)

اور وہ کہے گا کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، تمہارے لئے مٹی سے پرند کی مانند صورت بنادیتا ہوں۔ تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے، میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کورھی کو اچھا کردیتا ہوں۔ اور میں اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کردیتا ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو وہ تمہیں بتلا دیتا ہوں بے شک اس (سب) میں تمہارے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

لفظ آیۃ (نشانی) یہاں معجزہ کے مفہوم میں ہے۔ معجزہ ہر اس واقعہ کا نام ہے جو عام اور متعارف سلسلۂ اسباب سے الگ کسی پیمبر کی تائید یا شہادت میں واقع ہوتا ہے۔ فاعل اس کا تمام ترقی تعالیٰ ہی ہوتا ہے، جو ہر واقعہ موافق و معمول حسب سطور عام ہی کا ہوتا ہے۔ ۱۔

مِنْ رَّبِّکُمْ (تمہارے پروردگار کی طرف سے) یہ اضافہ اس کی تاکید اور اس حقیقت پر زور دینے کے لئے ہے کہ معجزہ کا ظہور حق تعالیٰ ہی طرف سے ہوتا ہے۔

نہ کہ پیغمبر کے اختیار و قدرت سے۔ اَخْلَقُ کے ذیل میں یہ سمجھ لیجئے کہ فعل خلق کی نسبت جب انسان کی جانب ہوتی ہے، تو مراد کسی فعل کے اندازہ کرنے اور ایک خاص انداز سے اس کے درست رہنے کی ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی زندگی معجزات کے لئے مشہور ہے عوام بجائے دلائل و شواہد عقلی کے ہمیشہ معجزات و خوارق ہی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور

یہودی تو اپنی انجیل پر پسندی اور طلب خوارق میں کچھ اور بڑھے ہی ہوئے تھے۔
گہیئۃ الطیر یعنی پرندوں کی شکل کے کھلونے مٹی سے بنا دیتا ہوں۔

فَانْفُخْ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا۔ یعنی میرے نفخ دم سے ان میں جان پڑ جاتی ہے۔
 اس معجزہ کا ذکر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں کی چاروں مستند انجیلوں میں تو نہیں ہے البتہ قبطی کلیسا (Coptic Church) کی جو مستند انجیل ہے اس میں

یہ صاف مذکور ہے، جیسا کہ ڈاکٹر نیج (Budge) نے اپنی کتاب (The Legends of our Lady Mary) کے مقدمہ ص ۲۹ پر نقل کیا ہے۔
 ”وہ پرندوں کی شکل کے جانور بتا دیتے تھے، جو اڑ سکتے تھے“

بِاِذْنِ اللّٰهِ اور یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے میرے ارادہ و تصرف سے نہیں، بس اللہ کے حکم و اختیار سے ہوتا ہے۔

الْاَكْمَةُ، اندھوں کو بینا کر دینے کا ذکر انجیل میں متعدد مقامات پر ہے مثلاً انجیل متی کے باب ۹ کے آیات ۲۷، ۳۰ میں ہے۔ اور انجیل مرقس کے باب ۸ آیات ۲۲ تا ۲۵ میں اور سب سے زیادہ تفصیل انجیل یوحنا کے باب ۹ کے آیات ۱ تا ۷ میں ہے۔ اور ان میں تصریح اندھے مادر زاد ہونے کی بھی ہے۔

الْاَكْبَرُ صَ، کوڑھیوں کا بھی ذکر انجیل میں دو جگہ ہے۔ انجیل متی باب ۸ آیات ۱ تا ۲ میں ایک کوڑھی کی شفا یابی کا اور انجیل لوقا باب ۱۷ کی آیات ۱۱ تا ۱۴ تک میں دس کوڑھیوں کے بالکل اچھے ہونے کا۔

اُحْيِ الْمَوْتَى۔ اب رہا معجزہ احیاء اموات تو بزنا بابر میں تو اس کی تصریح ہی موجود ہے کہ ص ۲۳۷ و ص ۲۳۸ انگریزی ایڈیشن مطبوعہ آکسفورڈ۔ باقی دو انجیلیں جو رازنہ کو مسلم ہیں وہ بھی اس کے حوالوں سے خالی نہیں۔ مثلاً انجیل لوقا باب ۷، آیات ۱۱ تا ۱۶ نیز آیت ۲۲۔ انجیل متی باب ۹، آیات ۸۔ ۲۵ اور انجیل یوحنا باب ۱۱۔ آیات ۱۔ ۴۴۔ تاکید اور تصریح کے لئے بِاِذْنِ اللّٰهِ مکرر آیا ہے، کہ کس ان خوارق و تصرفات کو میری جانب نہ منسوب کر دینا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا، محض حق تعالیٰ کی قدرت و مشیت کا کرشمہ ہے۔ اور آخر میں جو ذکر آپ نے لوگوں کی ذخیرہ کی ہوئی چیزوں کی اطلاع دی کا کیا ہے، وہ ایک مثال اور نمونہ ہے اس حقیقت کا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مخفی چیزوں پر مجھے بھی مطلع کر دیتا ہے آپ سے خوارق و عجائب کا صدور اس کثرت سے ہوا کہ انھیں کو دیکھ کر یہود نے آپ کو شعبہ باز کہنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ کا ذکر پہلی صدی عیسوی کے جوزیفس کی کتاب تاریخ آثار یہود (Jewish Antiquities) میں اسی حیثیت سے آیا ہے۔ بلکہ اس وقت تک بھی جیوش انسائیکلو پیڈیا کی جلد ۷ کے ص ۱۶۷ پر یون لکھا چلا آتا ہے۔

”یسوع نے بحیثیت معلم دین یا قانون ساز کے نہیں، بلکہ بحیثیت شعبہ باز کے اپنی زندگی میں شہر و ناموری گلیل کے سادہ مزاج باشندوں سے حاصل کی۔“

نیانہی یا پیرانے نبی کی تردید و تغلیط کے لئے نہیں آتا بلکہ ہر جدید پیامبر پرانے پیامبر کی تجدید و تکمیل و تصدیق ہی کے لئے ہوتا ہے اور ہر ہی بات آپ بھی فرما رہے ہیں کہ میں اپنی پیش زد کتاب توریت کی تصدیق کے لئے آیا ہوں۔“ //

قانونی جزئیات اور فقہی فروع میں تسہیل و تریم، عمومی تصدیق و تاکید کے ذرا بھی منافی نہیں۔ حضرت مسیح کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تمہارے جبر و دن اور ربتوں نے اپنی طرف سے جو احکام توریت میں خلط ملط کر دیئے ہیں میں اس سارے بوجھ کو

تم سے دور کرنے آیا ہوں ۱۱

یہ ساری پیش خیریاں مسیح کی زندگی میں پوری ہوتی چلی گئیں۔ ان آیتوں کے بعد مسیح کی زندگی کے اہل واقعات شروع ہوتے ہیں۔ جب مسیح کی زندگی میں بجز تھوڑے سے حواریوں (ماہی گیروں) کے اور کوئی ان پر ایمان نہ لایا۔ بلکہ ان کی تکذیب و تحقیر ہی پُر ضرر رہی تو اس وقت کا منظر۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمْ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ؟
قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۚ

جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے انکار ہی پایا، تو بولے میرا کون مددگار ہوگا
اشہد کے لئے تو حواری بولے کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔

یعنی جب مسیح اپنی برائی سچی تبلیغ کے باوجود یہود کے عمومی رویہ سے سخت دکھ اٹھاتے رہے اور ان کی طرف سے انکار ہی تہرہ و طغیان کے ساتھ پاتے چلے گئے، تو قوم کو نصرت دین کے لئے آواز دی۔ اس پر حواری بولے کہ ہم حاضر ہیں۔

لفظ حواری پہلی دفعہ آیا ہے، تو اس کا مفہوم بھی سمجھتے چلے۔

حواری لفظی معنی کپڑے کو دھونے اور اسے اجلا اور صاف کر دینے والے کے ہیں۔ اور حضرت کے ابتدائی مانتے والے سمندر کے کنارے کام کرنے والے ماہی گیر ہی تھے۔ اس لئے اس کے بعد آپ کے رفیقوں اور صحابیوں کا لقب ہی حواری پڑ گیا۔ اور مجازی معنی مخلص و مطہر کے بھی قرار پائے ۱۱

چنانچہ حدیث میں حضرت زبیر صحابی کے لئے حواری رسول کا لقب آیا ہے۔

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدُ بِاَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ (آیت ۵۲)

ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور آپ گواہ رہے گا کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا

مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ (آیت ۵۳)

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے اس پر جو کچھ آپ نے اتارا ہے اور ہم نے پیروی اختیار کی ان رسول کی سوہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو تصدیق کرتے ہیں۔

یہ اہل کتاب ہر دور کے سچے مسلمانوں کی طرح توحید کے پورے طور پر قائل تھے اور ابن اشتر اور "اقنوم" وغیرہ کے تخیل سے بھی نا آشنا۔ مسیح کے یہ صحابی مسیح سے گفتگو کرتے کرتے غلبہ توحید سے براہ راست اللہ سے مناجات کرنے لگے ہیں۔ قرآن مجید نے ایسے موقعوں پر بار بار یہ کیا ہے کہ بندوں کی گفتگو کا رخ دفعۃً اللہ سے مناجات کی طرف پھیر دیا ہے۔ کیا ٹھکانا ہے اس اہتمام توحید کا۔ اس کالم کے بعد جو کچھ گزری اسے بجائے تفصیل کے قرآن مجید نے اس موقع پر کمال ایجاز سے دو ہی لفظوں میں ادا کر دیا ہے۔

وَمَكْرُوءٌ وَمَكَرَ اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝ (آیت ۵۴)

اور ان لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ بہترین

خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔

لفظ "مکر" اللہ کی جانب منسوب کرنے سے آپ وحشت نہ کریں۔ یہ اردو کا کر نہیں جو ہمیشہ برائی ہی کے موقع پر آتا ہے اور جس کام ادب فریب اور دھوکا ہے۔ یہ عربی کا کر ہے جس کے معنی صرف خفیہ تدبیر کے ہیں۔ یہ بُرے اور اچھے ہر موقع کے لئے عام ہے حضرت مسیح پر مقدمہ چلنے اور پھر عدالت سے حکم سزا پانے کے بعد آپ جس طرح نفاذ سزا سے محفوظ رہے، یہ ساری داستان ایک دوسری صحبت میں تفصیل سے سنئے گا۔

————— ﴿۳۳﴾ —————

اسی سلسلہ میں چند آیتوں کے بعد ذکر حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا آتا ہے۔ اب

وہ ملاحظہ ہو:

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ
تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (آیت ۵۹)

بے شک حضرت عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک آدم کے حال کی طرح ہے، اللہ نے

ان کو مٹی سے بنایا۔ پھر کہا جاندار ہو، چنانچہ وہ وجود میں آگئے۔

یہ مثلیت عیسیٰ و آدم کے درمیان کس حیثیت سے؟ جواب ہے کہ بشر محض اور حادث
مخلوق ہونے کا اشارہ عیسائیوں کے عقیدہ ابن اللہیت کی جانب سے سوال انھیں سے
بورہا ہے کہ تم عیسیٰ کو فوق البشر کیسے مان رہے ہو؟ اگر یہ کہو کہ وہ بغیر باپ کے توسط کے
پیدا ہوئے، اس لئے فوق البشر ٹھہرے، تو پھر آدم کو بھی فوق البشر کیوں نہیں مانتے وہ تو
عیسیٰ سے بھی عجیب تر صورت سے پیدا ہوئے یعنی ماں اور باپ دونوں کے توسط کے بغیر۔
اللہ کسی بشر کے پیدا کرنے پر کسی مخصوص، متعین طریقہ وجود و ظہور پر مجبور نہیں بظنی مشیت
اس کے لئے کافی ہے۔ اور یہی تو آفرینش عیسیٰ میں پوری طرح مؤثر تھی

حضرت عیسیٰ کے بے باپ کے پیدا ہونے پر کوئی صراحتہ النص قرآن مجید میں نہیں
لیکن اتنے کھلے ہوئے اشارے اور قرینے موجود ہیں جو اس عقیدے کو قریب بہ صراحت بنا دیے
کے لئے کافی ہیں۔

خود سچوں میں ایک قدیم فرقہ (Arians) کا ہوا ہے۔ اس کا بانی Arius
چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں اسکندریہ کلاٹ پادری تھا۔ انسا بیکلو پڈیا برمانیکا
طبع چہار دہم کی جلد اول ص ۵۰۴ پر اس کی تعلیم بھی درج ہے کہ سچ قدیم و غیر مخلوق نہیں مخلوق
و حادث ہیں۔ اور ان سے بھی قبل تیسری صدی عیسوی میں انطاکیہ (انطاکیہ) کے بطریق پالی
کی تلقین بھی یہی تھی کہ عیسیٰ مسیح کی پیدائش ایک دوشیزہ کے بطن سے ہوئی تھی۔ یہ وسط
روح القدس اس لئے تھے وہ بشر محض، ہاں روح القدس کے توسط سے انھیں مقدس

بھی بنا دیا تھا۔ اس لئے وہ مسیح بھی تھے۔ لیکن شریک الوہیت بہر حال نہ تھے۔ اس عقیدہ کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف ری لیجیشن اینڈ ایتھنکس جلد ۱۱ ص ۱۷۱ مسیحیوں کے صاحبِ قسم طبقہ میں اصلاحی تحریکیں صحیح عقیدہ کی برابر اٹھتی رہی ہیں۔ لیکن کلیسا کے عام جمود و تعصب نے کبھی ان اصلاحوں کو آگے بڑھنے اور سرسبز نہ ہونے دیا۔ خود آج بھی مسیحیوں میں ایک فرقہ وارانہ (Unitarians) کے ناکس موجود ہے جس میں بڑے بڑے مشہور قابل فاضل ہوئے ہیں۔ مثلاً آنجنہانی الی، پی جیکس (L.P. JACKS) ایڈیٹر۔ ہبرٹ جرنل (HIBBERT JOURNAL) اس کی تعلیم بھی اسے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ یہ فرقہ تثلیث کا بالکل منکر و مخالف ہے اور حضرت مسیح کو افضل البشر اور برترین انسان مانتا ہے۔ لیکن ان کی الوہیت کا قائل کسی درجہ میں بھی نہیں!

—: (۳۲) پتہ: —

اور اسی مکالمہ مسیح و مسیحیت کے تتمہ کے طور پر وہ آیت بھی ملاحظہ ہو جائے جس کا تعلق سیرت نبوی کے ایک اہم واقعے سے ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ کے قیام کو نو سال ہو چکے تھے اور حجاز پر پورا تسلط مسلمانوں کا قائم ہو چکا تھا کہ ۹ ہجری میں بخران (NAGRAN) کے مسیحیوں کا ایک وفد چودہ ارکان پر شامل خدمت میں حاضر ہوا، گفتگو الوہیت مسیح پر رہی اور اسلامی عقیدہ یعنی بشریت مسیح کی معقولیت بالکل واضح و ظاہر تھی۔ لیکن وفد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ادھر آپ کو دھن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح یہ لوگ بھی دین حق قبول کر کے جنت کے وارث و حقدار بن جائیں۔ آخر میں آپ نے وہی کیا جو شاید ہر سچا اور مخلص داعی حق ایسے موقع پر کرتا۔ آپ نے فرمان خداوندی کے تحت عیسائیوں کو مباحلہ کی دعوت دے دی کہ زبانی گفتگو تو بہت کچھ ہو چکی، اب آؤ، ہم تم اپنے خاص عزیزوں کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے پروردگار ہی سے بضرع و بحساح

عرض کریں کہ جو فریق ناحق پر ہوا اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو، آپ نے یہ فرمایا اور اپنی اولاد حقیقی و حکمی یعنی سیدہ فاطمہؓ و سیدنا علیؓ، سیدنا حسنؓ، سیدنا حسینؓ کو ہمراہ لے کر تشریف لے آئے، لیکن تاریخ کے راوی کا بیان ہے کہ عیسائیوں کی ہمت صین وقت پر جواب دے گئی، اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ بجائے اس آزمائش میں پڑنے کے، جزیرہ دے کر اور ذمی رعایا بن کر اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا گوارا کر لیا۔ //

اب قرآن کا بیان سنئے

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَابْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ
وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ
عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ (آیت ۶۱)

ترآپ (ان سچوں سے) کہہ دیجئے کہ اچھا آؤ ہم بلا لائیں اپنے بیٹوں کو
بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو اور تمہاری عورتوں کو بھی اور اپنے کو بھی اور
تمہارے تئیں بھی، پھر ہم خشوع سے دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں۔

سر ولیم میور کی سیرت محمدی (Life of Mohammed)
انیسویں صدی میں اپنے موضوع پر مشہور ترین کتاب تھی اور سر ولیم میور کوئی مسلمان
نہیں، مسیحی تھے، اور محض مسیحی ہی نہیں، مشنری یا مبلغ مسیحیت بھی۔ اپنی اسی کتاب میں
صفحہ ۳۶ پر واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

واقعہ میں محمدؐ کے ایمان کی سچائی بالکل نمایاں ہے: نیز ان کے اس عقیدہ کی
شہادت کہ ان کا تعلق عالم غیب سے جڑا ہوا ہے اور اس لئے کہ حق تا ستر انھیں کے
ساتھ ہے۔ اور یہ کہ ان کے خیال کے مطابق مسیحوں کے پاس بجز ظن و تخمین کے
کچھ نہ تھا۔ //

﴿۳۵﴾

توحید پر زور تو قرآن مجید میں بے شمار بار آیا ہے۔ یہاں بھی دو آیتوں کے بعد اہل کتاب نصرائیوں سے خطاب اس موضوع پر زور دار انداز سے ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنِنَا
وَبَيْنَكُمْ إِلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا
وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا
فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ (آیت ۴۳)

آپ کہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آجاد ایسے معمول کی طرف جو ہم میں تم میں
مشترک ہے کہ ہم بجز اللہ کے کسی کی پرستش نہ کریں، اور نہ کسی کو اس کا شریک
ٹھہرائیں اور نہ ہم کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائیں، پھر اگر وہ شبہ کریں
تو تم کہہ دو (اے مسلمانو) کہ تم گواہ رہنا ہم تو ہر حال فرما ہر دار تھے۔

سَوَاءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ یعنی وہ بنیادی عقیدہ جو ہم مسلمانوں اور تم نصرائیوں
دونوں کو مسلم ہے اور وہ دونوں میں مشترک ہے جس کی قدر و قیمت اور افادیت پر
سب کو اتفاق ہے اور جس کی تعلیم تمہارے ہاں کے پیران برحق ہمیشہ دیتے آئے
ہیں، اور یہودیت و نصرائیت دونوں دینوں کی بنیاد ہی اسی اصل پر ہے
توحیدیت تو خیر تا کید توحید اور رد شرک کے لبریز ہی ہے، انجیل میں بھی تعلیم یہی موجود
ہے۔ متی باب ۱ کی آیت ۱۰ میں ہے:

”تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر“

اور یہ تو ساری انجیلوں میں کہیں بھی نہیں ملتا ہے، نہ صراحت نہ دلالت نہ اشارہ کہ
کچھ پرستش تو صرف خدا کی کرو اور بعض پرستشوں میں ابن اللہ اور روح القدس کو بھی

شریک کر لیا کرو۔

اَدْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ، مخلوق پرستی اور مخلوق کی شرکت الوہیت کی تردید
تو آپ سن ہی چکے۔ اب تردید مخلوق کی ربوبیت کی ہو رہی ہے۔ بغیر ان شر جس طرح موجود
اک نہیں، اسی طرح رب و مطاع مطلق بھی نہیں۔ نصرانیوں نے طرح طرح کے شرک نکال لئے
تھے، اسی طرح عصمتیں بھی طرح طرح کی گڑھ رکھی تھیں۔ پاپائے روم کی مصوبیت،
کیتھولک دنیا، اور کلیسا یعنی پادریوں کے اجتماع کی مصوبیت کل مسیحی دنیا کا متفقہ
عقیدہ ہے۔ ان سائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع چار دہم، جلد ۱۶ ص ۶۳ پر یہ عقیدہ
یوں درج ہے :

”ایک مخصوص کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اس پر ہمیشہ روح القدس کا

سایہ رہتا ہے۔ اس لئے مسائل میں کلیسا سے امکان خطا ہی نہیں۔“

قرآن مجید نے انسان کی ان ساری خود ساختہ عصمتوں پر ضرب لگا دی اور کسی کو
رب ٹھہرانے کے لئے یہ لازمی نہیں کہ لفظاً و قولاً اسے رب ہی کہا جائے۔ کسی فقیہ کو مرشد کو
امام کو اگر معصوم مان لیا اور اس کے قول کو دلیل سے بے نیاز قرار دے لیا تو یہ اسے رب ہی
مان لینا ہوا۔ //

بَعْضُنَا بِعَعْضًا سے مفسر ابن حبان غرناطی نے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ الوہیت
ربوبیت دونوں کی تردید تو اسی ایک فقرے سے ہو گئی۔ جب ایک دوسرے میں ثلثیت
اور رشتہ ہم نسبی کا قائم ہو گیا تو سب بندے ہونے کی حیثیت سے برابر ہو گئے۔ اور
الوہیت و ربوبیت اب باقی ہی کہاں رہ گئی۔

فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ، قرآن کے اعجازی انداز بیان کا ایک اور نمونہ۔
اہل کتاب نصرانی یا یہودی تو آج بھی اسلام کی توحید خالص کی گواہی دے رہے ہیں۔ اور وہ
اپنی کتابوں میں لکھتے چلے آ رہے کہ مسلم قوم توحید خالص کی حامل ہے۔

— (۳۶) —

یہ بنیادی حقیقت کہ دین مقبول اللہ کے ہاں صرف اسلام ہی ہے نہ کہ ہر وہ چیز جسے دین کے نام سے پکارا جاتا ہے پہلے بھی بیان ہو چکی تھی اور اس سورہ آل عمران میں

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ -

دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔
یعنی اسلام اپنے اصطلاحی معنی میں، ورنہ لفظی معنی میں تو ہر جھک جانے کو اسلام ہی کہتے ہیں

اب یہاں اس سے بڑھ کر قطعی صورت میں اعلان ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ
وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ ۝ (آیت ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دین (اپنے لئے) تلاش کرے گا وہ اسے
ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا۔ اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں ہوگا۔

تاکید در تاکید دیکھیے، اثباتاً و نفیاً دونوں طریقوں سے بیان کا ماحصل یہی ہے

کہ دین نجات دلانے والا، آخرت میں کام آنے والا دین تو بس ہی اسلام ہی ہے۔
جس کی کتاب قرآن ہے، اور جس کے لانے والے محمد رسول اللہ ہیں۔ اس ایک دین
کے سوا اور جتنے بھی دین اپنی موجودہ صورت میں موجود ہیں، ان کی مثال فرسودہ اور
ہلکسال باہر سکوں کی ہے کہ کہنے کو سیکے تو وہ بھی ہیں۔ لیکن وہ سکے جب بازار میں چل نہ
سکیں تو ان کا سکہ ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ دوسرے دین و مذہب اصلاً کیسے ہی رہے
ہوں ان کی موجودہ صورت میں انھیں دین حق کی طرح سچا سمجھنا، ہر دین و مذہب کے

نجات کے لئے کافی سمجھنا، یا سب مذہبوں کو ملا جلا کر ان کا ایک ملغوبہ تیار کرنا نام پر کتنا کہ
ویر و حرم، کعبہ و کلیسا، شیخ و برہمن، مسجد و بت کدہ، سب یکساں ہیں اور ایک حکم میں
داخل، یہ سب ضلالت و بے دینی ہی کی شکلیں ہیں، اکبر و فیضی، ابوالفضل، داراشکوہ
وغیرہ ان ناکام کوششوں کے لئے بجا طور پر بدنام ہو چکے ہیں اور وحدت ادیان کے
نام سے آج بھی بعض اہل قلم اسی نام و مرض میں مبتلا، اپنی روشن خیالی اور رواداری کے
پردے میں اعلان اسی بد دینی کا کر رہے ہیں۔

— پیچہ (۳۷) —

خانہ کعبہ کی قدامت بھی اہل کتاب کے لئے ایک مختلف فیہ مسئلہ رہی ہے۔ قرآن مجید
نے اس کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے، پہلے ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صحیح مقتدرائی اور شہوانی کا

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَ
مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ آیت ۹۵

آپ کہہ دیجئے (اے رسول) کہ اللہ نے سچی بات فرمادی تو تم پیروی کر دیجی
راہ پر چلنے والے ابراہیم کے دین کی اور وہ تو مشرکین میں سے نہ تھے۔

یعنی قرآن نے امر حق واضح کر دیا اور تم نے جو جھوٹ اپنے ہی اکابر اور اپنے ہی
مقدس مقاموں و نشوونما پر باندھے تھے، ان سب کی قلعی کھول دی۔ تو تم سب، کیا اہل کتاب اور
کیا مشرک، ابراہیم ہی کی پیروی کرو۔ اور خود بھی سچے اور ان کا لایا ہوا دین بھی سچا۔ اور جنہیں
تم بھی اپنا پیشوا مانتے ہو۔ ان میں تو ہر حال کہیں سے بھی شاہد شرک نہ تھا۔

اور اس کے معاً بعد ذکر ان کے شہر مکہ اور ان کی تعمیر کعبہ کا ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ
مَبْرُكًا ۚ وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ۝ آیت ۹۶

بے شک سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے (سب کے لئے) برکت والا اور سارے جہاں والوں کے لئے رہنما۔

دنیا میں پہلا مکان بہ طور عبادت گاہ کے، یعنی خانہ کعبہ، جس کی روایات حدیث کے مطابق ابتدائی تعمیر حضرت آدمؑ نے کی تھی اور منہدم ہونے کے بعد پھر اس کی از سر نو تعمیر حضرت خلیلؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

قرآن کریم دعویٰ سے کہتا ہے کہ قدیم ترین عبادت گاہ اس سرزمین پر ہے اور دیکھیے کہ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ (HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD) والے کیا کہتے ہیں۔

”یہ پتھر کی مریخ عبادت گاہ جس کی عمر نامعلوم قدامت کی ہے، مکہ کے حدو کے اندر تھی“ (جلد ۸ ص ۱۰۵)

اور پھر کہتے ہیں:-

”نسلہا نسل سے یہ مقدس ترین عظمت کی حامل رہی ہے۔ اور اس کی

بابت عقیدہ یہی رہا ہے کہ خود یہود اور (خدا) نے اسے عرب قوم کو بہ طور تحفہ دے دیا تاکہ وہ دوسری قوموں پر اس قوم کے تفوق کی گواہ رہے۔

یہ ابراہیم اور ان کے فرزند اسماعیل کا عبادت خانہ بیت اللہ رہا ہے“ (جلد ۸ ص ۱۶۸)

گویا اس کی قدامت کی تاریخ، تاریخ کے حافظہ میں بھی نہیں۔ اتنی غیر معمولی قدامت

فرنگی فاضلوں کو بھی تسلیم ہے اور اس کا شروع ہی سے عبادت خانہ ہونا مسلم ہے۔ کعبہ کو

قدیم ترین عبادت گاہ کہہ کر یہود کو بتا دیا گیا کہ یہ بیت المقدس سے بھی قدیم تر ہے۔

اور سنئے عہد نامہ عتیق میں اتنی تحریف و تصرف کے باوجود بھی ایک جگہ ذکرِ بکہ کا

باقی رہ گیا ہے۔ چنانچہ زبور داؤد کی مناجات ۸۴ کی آیت ۶ میں ہے۔

”وہ بکہ کی وادی میں گزرتے ہوئے اسے ایک کنواں بتاتے“

اور بائبل کے قدیم مترجموں نے ترجمہ میں اپنی بے احتیاطی کی عام عادت کے مطابق اسے بجائے علم اور اسم مکان قرار دینے کے اسم نکرہ قرار دے دیا ہے۔ اور اس کا ترجمہ ”رونے کی وادی“ کر ڈالا۔ صدیوں کے بعد اب غلطی کا احساس ہوا، اور اب جیوش انسائیکلو پیڈیا میں اقرار ہے کہ یہ ایک مخصوص بے آب وادی کا نام ہے (جلد ۲ ص ۱۱۵) اور اب جتنا قریب آگے ہیں تو انہیں یہ لکھنے کی توفیق اور دے کر ہی وادی بے آب کہ معطلہ ہے۔

بکۃ۔ کہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ عربی علم الصرف کے ایک قاعدہ کے مطابق یم اور ب کے درمیان تبادلہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لازم اور لازم اور راتم و راتب کی مثالیں ہیں۔

اسی قاعدہ کے ماتحت کہ بکہ کا مراد و تبادلہ ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ نام ہے کل شہر کا۔ اور بکہ کا اطلاق ہوتا ہے مسجد حرام اور مطاف پر۔ ان مختصر لفظوں میں اس کی دو صفات بیان کر دی گئی ہیں۔ ایک مُبَادَرُکَا یہ وہ مقام ہے جہاں مادی اور روحانی، دینی و دنیوی برکتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ دوسرے هُدًى لِلْعَالَمِينَ سارے جہاں کے لئے مرکز ہدایت ہے۔ بطور قبیلہ کے

اور مؤرخ مسعودی نے اہل جاہلیت کا یہ عقیدہ نقل کیا ہے کہ بیت الحرام ستارہ زحل کا ہیکل (مندر) ہے اور زحل اس کا مرتب ہے۔ اور چونکہ زحل کی بقائے دوام ہے۔ اس لئے جو چیز بھی اس کی جانب منسوب ہوگی اسے بھی زوال نہ ہوگا۔ اور اس کی تعظیم و تکریم سدا باقی رہے گی۔ عقیدہ جاہلیت کا سہی تاہم اس سے شہادت تو کعبہ کی قدمت کی ہی جاتی ہے۔

—: (۳۸) :—

قرآن مجید کی چوتھی سورت کا نام سورہ النساء ہے۔ اور نسا کہتے ہیں عورتوں کو۔ اس لمبی سورہ میں بیشتر بیان عورتوں کے مسائل اور ان کے احکام اور عورتوں کے حقوق و فرائض کا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نظام معیشت میں کتنا بڑا دخل اور کتنی اہمیت عورت کو حاصل ہے۔ علاوہ بیسیوں متفرق عنوانات کے ایک مستقل سورہ ہی اس موضوع پر ہے۔ پہلی ہی آیت کتنے مختلف پہلوؤں پر شامل اور کسی کسی حکمتوں کی جامع ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ
نَفْسٍ وَاحِدَةٍ

اے لوگو! تقوٰے اختیار کرو اپنے پروردگار کا جس نے تم (سب) کو
ایک جان سے پیدا کیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ خطاب قریش، بلکہ محض اہل عرب سے بھی نہیں، بلکہ سارے
ہی انسانوں، نوع بشر سے ہے۔

یہ عنوان خطاب بجائے خود پیام اسلام کی عالمگیری کا اعلان کر رہا ہے۔ انسان
کسی نسل، کسی رنگ کا ہو، ہر حال ایمان کا بلکہ کسی حد تک تقوٰے کا مکلف ہے۔ الناس
یوں سارے نوع بشر کے لئے ہے۔ اور پھر جب سورت کی ہے بھی نہیں۔ بالاتفاق
مدنی ہے۔

اتَّقُوا رَبَّكُمُ اشر سے ڈرنا دراصل اس کے احکام کی مخالفت سے ڈرنا ہے
ورنہ اشر تعالیٰ کی ذات بجائے خود کوئی خوف کھانے والی چیز نہیں۔ بلکہ سراسر محبت
عظمت ہی کے قابل ہستی ہے اور لفظ رَبَّكُمُ لاکر اشارہ کر دیا ہے کہ جن احکام کی

مخالفت سے ڈرایا اور رد کا جارہا ہے۔ ان سے مقصود تماشہ بندے ہی کی ربوبیت اور پرورش ہے۔

خَلَقَكُمْ ^{مسئلہ ارتقاء جس حد تک اور جس معنی میں بھی صحیح ہو، قرآن مجید کو اس}
کوئی بحث نہیں۔ وہ زور صرف اس پر دیتا ہے کہ انسان چاہے بتدریج ہی وجود میں آیا ہو
بہر حال اللہ کا خلق کیا ہوا، نیست سے ہست میں اللہ ہی کا لایا ہوا ہے۔ وہ ضرب انسان
کی خود وجودی پر لگاتا اور اثبات اس کی مخلوقیت کا کر رہا ہے۔ ۱۔

مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ، یعنی ابوبشر آدم علیہ السلام ہے اور حدیث نسل
انسانی کا سبق اپنے علی اور دور رس نتائج کے لحاظ سے بڑا ہی اہم ہے۔ آخری مورث
علی ہر فرد بشر کے، ہر کالے اور ہر گورے کے، ہر برہمن اور ہر شہود کے، ہر ہندی
اور ہر چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے، ابوبشر حضرت آدمؑ ہیں۔ یہ نہیں کہ ظاں
نسل کے مورث علی کوئی ہوں، اور ظاں نسل کے کوئی اور۔ اور نہ یہ کہ برہمن نسل کے لوگ
برہما جی کے سر سے پیدا ہوئے اور پھتری نسل والے برہما جی کے سینے سے اور ویش
ان کی ٹانگوں سے۔۔۔ اصلاً سب انسان انسان ایک ہی ہیں۔ آج کا انسان
اگر اسی ایک سبق کو یاد رکھ لے تو جنگیں اور خون ریزیاں کتنی کم ہو جائیں اور معاہدہ
ارشاد ہوتا ہے وخلق منها ذویہا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، یعنی حوا
زوجہ آدم علیہ السلام کو۔ یہ تخلیق کس طرح سے ہوئی ہے اس کے ذکر سے قرآن مجید
بالکل خاموش ہے اور حدیث بھی تقریباً۔۔۔ جس سے معلوم اور معروف روایت کا حوالہ
دیا جاتا ہے، اس میں ذکر نہ آدم کا نہ حوا کا۔ اس میں بیان محض عورت کی کج سرشتی کا ہے
مِنْهَا میں هَآ کی ضمیر عموماً نفس کی طرف راجع سمجھی گئی ہے لیکن ایک دوسرا
قول بھی تفسیروں میں نقل ہوا ہے کہ مِنْهَا یہاں جنسہا کے معنی میں ہے۔
کبیر میں ابوسلم اور بکر المحیط میں ابن حجر کے حوالہ سے اور جنس عورت کے معنی لیکر۔

تو حضرت حوا کی ذات کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا۔

یہ روایت تو صرف تو ریت مردہ کی ہے کہ خدا نے آدم کی ایک پسلی ان کے سونے کی حالت میں نکالی اور نکالی ہوئی پسلی سے ایک عورت پیدا کر کے آدم کے پاس بھیج دی۔ اور یہ روایت صحیفہ پیدائش باب دوم کی آیت ۲۲-۲۳ میں ہے۔
 رہی حدیث بنوی تو جس حدیث کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے تو وہاں ذکر نہ حضرت آدم کا ہے نہ حضرت حوا کا بلکہ محض عورت کی جنس کی پیدائش اور اس کی کج شرعی کا ہے۔ پھر یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ حدیث میں حضرت حوا کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے بہ طور استعارہ ارشاد کر دی گئی ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ انسان کی پیدائش جلد بازی یا غلبت پسندی سے ہوئی ہے۔ اور تفسیر بحر المحیط میں اسی پہلو کو پیش کیا گیا ہے، اور اس معنی کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ حوا کو اس طرح پیدا کیا گیا، بلکہ جنس عورت کا ذکر ہے اور یہ بہ آسانی مجاز و استعارہ پر محمول ہو سکتا ہے۔ چنانچہ لغت حدیث مجمع البحار میں یہ قول کرمانی کے حوالہ سے نقل ہوا ہے اور ایک حاشیہ تفسیر ابن کثیر میں بھی ایسا ہی نقل ہوا ہے۔

اور خود ایک حدیث بنوی صحیح بخاری کی کتاب النکاح میں اور صحیح مسلم کی کتاب الرضاع میں اس مضمون کی نقل ہوئی ہے کہ عورت مثل پسلی کے ہے اور لغت میں خود ضلع کا مفہوم تو ثنائی ہی ہے۔ ورنہ اصل معنی تو کجی یا میل یا انحراف ہی کے ہیں۔ زنجبیری کی مشہور لغت حدیث کتاب الفائق میں ہے الضلع للمیل یعنی ضلع جھکاؤ کو کہتے ہیں اور اسی سے ملتی ہوئی عبارت ابن اثیر کی لغت حدیث نہایت ہی ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے :-

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً

اور پھیلا دیے ہم نے ان دونوں سے مرد اور عورت کثرت سے

دنیا کی انسانی آبادی اب تک جتنی ہو گئی اور جتنی قیامت تک ہوگی سب اسے
 ہوگی۔ لفظ کثیر کا اطلاق اگر اس آن گنت آبادی پر بھی نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا؟
 خیال اس سلسلہ میں صرف یہ رہے کہ یہ نسل غیر محدود و غیر محدود حضرت آدمؑ
 ہی کی نہیں بلکہ آدمؑ و حواؑ دونوں کی ہے

وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ

اس اللہ سے تقوٰی اختیار کرو جس کے واسطے ایک دوسرے سے مانگتے

ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی۔

تقوٰی الہی یا ادائے حقوق اللہ کا حکم ابھی مل چکا ہے، اور ایک ہی آیت کے
 اندر دوبارہ پھر مل گیا۔ جتنی تاکید اس سے مقصود ہے ظاہر ہی ہے، لیکن اب کی جو حکم تقوٰی
 ملاوہ ارحام یعنی عزیزوں یا قرابت داروں کے باب میں ہے، اور الارحام کا عطف
 اللہ پر ہے اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جس طرح محتاط حقوق اللہ کے باب میں
 رہتے ہو۔ اسی طرح قرابتوں کے معاملہ میں بھی رہو۔ یہ ہے قرابت یا رشتہ داری کی

اہمیت اسلام میں!

درحقیقت امت کے نظام اجتماعی کا سنگ بنیاد ہی شریعت نے خاندان کو قرار دیا
 ہے، عزیزوں، قریبوں، خاندان اور برادری والوں کے ساتھ حسن سلوک اسلام میں کوئی
 دوسرے درجہ کی نہیں۔ اول درجہ کی اہمیت رکھنے والی چیز ہے۔ اور اس معنی میں ایک
 حدیث بنوی بھی ہے کہ رحم یعنی رشتہ قرابت اللہ سے دعا کرتا رہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے
 رکھتا ہے اللہ اسے جوڑے رہے۔ اور جو مجھے قطع کرتا ہے اللہ اسے قطع کرے اور
 آیت کا خاتمہ اس ٹکڑے پر ہوتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (آیت ۱)

بے شک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے۔

یعنی اس حکم کو ہلکا اور سرسری نہ سمجھو، وہ عالم الغیب جس طرح تمہاری عبادتی زندگی کانگراں ہے اسی طرح وہ تمہارے خانگی، اجتماعی سارے ہی معاملات کانگراں ہے!۔ آج اس حکم کا استحضار اگر دلوں میں رہے تو اُمت کے اندر اس قدر تلخیوں، رنجشوں، خانہ جنگیوں کا وجود کہیں باقی نہ رہ جائے؟ لیکن بہر صورت جہاں تک کتابی تعلیم کا تعلق ہے، اسلام خانگی حقوق اور ذمہ داریوں کی تاکید کے لحاظ سے بس آپ ہی اپنی مثال ہے۔

—: (۳۹) :—

مذہب کے دائرے میں ایک اہم مسئلہ توبہ اور قبول توبہ کا آتا ہے، گناہ نام ہے کسی حکم الہی کی دانستہ خلاف ورزی کا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بشری فطرت کی کمزوری کے لحاظ سے گناہوں کا صدور تو ناگزیر ہے، توبہ گرفت اور عذاب الہی سے بچنے کی کوئی راہ بھی ہے! بعض مذہبوں نے کرم یا مکافات عمل کے قانون کے نام سے اس باب کو سرے سے بند ہی کر دیا ہے، یہ کہہ کر کہ ہر شخص کو اپنے ہر عمل کا نتیجہ ہر حال میں بھگتنا ہی پڑے گا، اور بعض مذہبوں نے اس کے برعکس معافی کا دروازہ شفاعت کے تحت میں لا کر اتنا وسیع کر دیا ہے کہ کوئی گناہ گناہ ہی نہیں رہ جاتا جب ایک مستقل اور مطلق شافع موجود ہے، تو پھر وہ ہر مجرم کو چھڑا ہی لے گا اور جزا کا قانون سرے سے معطل و مہل ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے حکیمانہ راستہ توسط و اعتدال کا اختیار کیا ہے، اس نے ہر اختیاری جرم کے لئے ندامت، پچھتاوے، کی راہ کھلی رکھی ہے، جب بھی مجرم کو اپنی غلطی، غلط کاری کا احساس ہو جائے، اس کا غلی سدا رک تلافی اور کفارے سے کر دے اور اگر اس کی گنجائش ہی نہ باقی ہو تو حاکم مطلق کی بارگاہ میں معافی پیش کرے، پچھتاوے، گڑا گڑاے، روئے دھوئے، وہ عقیدہ رحیم توبہ قبول کرے گا، اور اسے معافی کا پروانہ عنایت کر دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ
بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ
يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (آیت)
توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے، وہ تو بس انہیں لوگوں کی ہے
جو بڑی حرکت نادانی سے کر گزرتے ہیں، اور پھر قریبی وقت میں توبہ
کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے، اور اللہ بڑا علم والا
بڑا حکمت والا ہے۔

يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ - سُوء کا لفظ عام ہے، چھوٹی بڑی ہر
ہر معصیت کے لئے۔ جہالت کے معنی نادانی کے ہیں۔ یہاں جرم کی نفسیت بیان
کی ہے کہ جرم کے ارتکاب کے وقت اس کے نتائج کا ذہن سے ذہول ہو گیا۔
اور عقل سلیم غلبہ ہر جان نفس سے وقتی طور پر اندھی ہو گئی۔ علی اللہ اللہ کے ذمہ۔
حقیقتہً تو اللہ پر واجب کوئی بھی چیز نہیں۔ یہاں قبول توبہ کو اللہ پر واجب تاکید
کے معنی و مفہوم میں فرما دیا گیا ہے۔

مِنْ قَرِيبٍ، توبہ جتنی جلد کر لی جائے، یعنی غلبہ نفس اور مغلوبیت عقل کے
وقت جو گناہ سرزد ہو جائے اس پر پشیمانی اور اس عمل سے باز رہنے کا غزم
جس قدر جلد قائم کر لیا جائے، اتنے ہی قبول توبہ کے موقع زیادہ رہتے ہیں۔
اور جتنی اس میں تعویق و تاخیر ہوتی چلی جائے گی، اسی قدر قبول توبہ کے امکانات
بھی ضعیف ہوتے جائیں گے۔ لیکن شریعت نے عین شفقت و رحمت اور
بندہ نوازی سے کام لے کر اس قرب کی میعاد عین حضور موت سے قبل تک
وسیع کر دی ہے۔ ابن عباسؓ صحابی اور متعدد تابعین سے آیت کی شرح و تفسیر
میں یہی منقول ہے۔

كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وہ اپنے مرتب علم کے لحاظ سے خوب جانتا ہے کہ کون مخلص ہے اور دل سے توبہ کرنے والا ہے اور اپنی شانِ حکمت کے لحاظ سے مناسب غیر مخلص کو بھی رسوا کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دیتا۔

وَلَيْتَ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ حَتَّىٰ
إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْإِثْمَ
وَالَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارًا أُولَٰئِكَ
أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (آیت ۱۸)

اور توبہ ان لوگوں کی نہیں، جو برابر گناہ کرتے رہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو، اور اس وقت وہ کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ (ان لوگوں کی) جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں ان کے لئے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔
یعنی قاعدہ اور ضابطہ ایسے لوگوں کی بخشش کا نہیں، جو گناہوں میں ڈوبے رہتے ہیں اور انھیں کو اپنا شعار زندگی بنا لیا ہے۔ ان سے قبولِ توبہ کا وعدہ نہیں۔ باقی اگر کسی سے وہ غفور و رحیم رحمت و مغفرت سر ہی کا معاملہ کرنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کی راہ میں کسی کی کیا مجال جو حائل ہو سکے۔

إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ، یعنی عالمِ ناسوت کے حدود شکست ہونے کے بعد، عالمِ غیب کا مشاہدہ ہونے لگے، تو اب توبہ پختہ نہ رہے گی، بلکہ اضطرابی بن جائے گی جو مقبول کسی درجہ میں بھی نہیں۔

آیت ماقبل میں السُّوءُ بمعنی واحد تھا۔ اور اب ”سَيِّئَاتِ“

(پصیفہ جسمع) آگیا۔ یہ فرق قابل غور و کاظ ہے۔ پہلی آیت میں ذکر جلد توبہ کر لینے والوں کا تھا، اور اس دوسری آیت میں ان کا ہے۔ جو اپنے گناہوں کا بوجھ نفسا میں ڈوب کر برابر بڑھاتے جاتے ہیں۔

وَهُمْ كُفَّارٌ۔ کافر کی توبہ کا موت کے وقت غیر مقبول رہنا پہلی آیت میں شامل تھا۔ عجب نہیں کہ یہ مزید تاکید و مزید تفضیح کے لئے ہو۔

۵۱۱۴۵
۵۱۲۹۰



چوتھا خطبہ

—: (۲۰) :—

فطرت نے انسان کی تقسیم دو جنسوں میں، اس کی پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی ہے۔ نر اور مادہ، مذکر اور مؤنث، مرد اور عورت اور ان دونوں کے باہمی تعلق کا مسئلہ شروع سے نازک و پیچیدہ چلا آ رہا ہے۔ پُرانی تہذیبیں تو زیادہ تر اس طرف گئیں کہ عورت ایک صفت حقیر و ذلیل ہے۔ مردوں کی محکوم اور باندی۔ بچپن بھر باپ کی قید میں رہے۔ بڑی ہو کر بھائی یا شوہر کی جگر بندیں۔ اور آخر عمر میں لڑکوں کی کڑی نگرانی میں۔ جدید تہذیب کا ردِ عمل اس کے ٹھیک برعکس اس حد تک ہوا کہ نوبت مادرِ پدرِ آزادگی کی آگئی۔ اب دیکھیے کہ قرآن اس مسئلہ کو کس حکیمانہ و عادلانہ نظر سے دیکھ رہا ہے۔ سعادۃ النساء تو ہے ہی خاص عورتوں کے مسائل کے لئے، اس کی آیت ۳۲ ملاحظہ ہو:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ

اور تم ایسے امر کی تمنا نہ کیا کرو، جس میں اللہ نے بڑائی دے رکھی ہے تم میں سے ایک دوسرے پر۔

بڑائی سے مراد ہے طبعی اور وہی طور پر بلا دخل کسی عمل و کسب کے، مثلاً کوئی دولت مند ہے، کوئی حسین و جمیل ہے، کوئی خوش گلو ہے، کسی کے قوائے جسمانی بڑے مضبوط ہیں، اس قسم کے طبعی و وہی فضائل کو قرب حق میں مطلق دخل نہیں، اور ان کی بناء پر ایک دوسرے پر رشک کرنا، ایک دوسرے کے مثل و مانند ہونے کی حسرتِ تمنا کرنا

درست نہیں۔ قرب حق میں دخل صرف عمل و اکتساب کو ہے، رحمت و مغفرت و قرب حق کا مدار تو اعمال ارادی و اختیاری پر ہے۔

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُواْ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ
مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ (ثابت) ہے، اور عورتوں کے لئے
اُن کے اعمال کا حصہ (ثابت) ہے۔

اور اس حیثیت سے مرد اور عورت کی حیثیت بالکل یکساں ہے۔ عورتوں کے لئے بھی قانون وہی ہے جو مردوں کے لئے۔ یہ فرق محض تکوینی مصلحتوں سے رکھ دئے گئے ہیں۔ ان میں رشک و حسرت کا کوئی محل نہیں۔ یہ نہیں ہونے کا کہ مرد کا کچھ اجر اس کے مرد ہونے کی بنا پر بڑھ جائے، یا عورت کا کچھ اجر اس کے عورت ہونے کی بنا پر گھٹ جائے۔ ایک تکلف بشری مخلوق ہونے کی حیثیت میں، اس میں اور مرد میں کوئی فرق نہیں۔ مرد، مرد ہونے کی حیثیت سے ہرگز اللہ کے ہاں مقرب تر، اور نجات کا مستحق تر نہیں اور عورت ہرگز اپنی جنس کی بنا پر کسی اجر و قرب سے محروم نہ رہے گی۔ عورت اپنا احساس کمتری دور کرے اور سمجھ لے کہ وہ مرد سے فرد تر مخلوق نہیں۔ جیسا کہ بعض دوسرے مذہبوں نے قرار دے رکھا ہے۔

ہندوؤں نے اپنے منہ سمرتی کے اوراق میں اور کتھولک کلیسا نے اپنے جلسوں اور کونسلوں میں صدیوں تک جو فیصلے عورتوں کی پستی اور پست فطرتی کے کئے ہیں ایت ان سب کی تردید کرتی رہی ہے، اور آگے ہے۔

وَأَسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (آیت)
اللہ سے اس کے فضل کی طلب کرو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔

چنانچہ اس نے اپنے علم کامل کے مطابق ہر مخلوق کو صلاحیت اور استعداد بخشی اور

وہی ہر ایک کی فرد عمل پر پوری طرح مطلع بھی ہے، تو اس کا فضل توفیق اعمال میں بے شک طلب کرتے رہو۔ رشک و تناد والی اور دعاؤں میں طلب کرنے والی چیز وہ وہی طبعی خصوصیتیں نہیں، بلکہ یہ نعمت توفیق حسنِ عمل ہے۔

اور ایک آیت کے بعد آگے ارشاد ہوتا ہے :-

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ
عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ (آیت ۳۳)

مرد عورتوں کے سر دھڑے ہیں، اس لئے کہ اللہ نے انہیں ایک دوسرے پر
بڑائی دی ہے، اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کروہانیا کی دنیا میں قرب حق و حسنِ عمل کے معاملہ میں
مرد و عورت کی حیثیت مساوی ہے۔ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ اور حج اور بہت سی عبادتیں
جس طرح مردوں کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے بھی۔ اب یہ بتلایا جا رہا
ہے کہ مرد و زن کی یہ مساوات دیکھانی دنیوی معاملات میں انتظامی حیثیت سے قائم نہیں۔
دونوں حیثیت عجب بالکل ایک ہیں۔ اعمال کی قبولیت کے باب میں عن اللہ بالکل ایک
ہیں لیکن دنیا میں شریعت کا حکم ہے کہ باپ افسر ہو کر رہے، اور بیٹا ماتحت ہو کر وہ حکم دے
اور یہ حکم مانے، اب بتایا جا رہا ہے کہ معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر غلبہ و
تفوق حاصل ہے۔ ”قَوَّام“ کے معنی ہیں کسی شے کے محافظ و منتظم، سربراہ ہونے کے
مراد یہ ہے کہ عورتوں کے امور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے، اور
احکام کے نافذ کرنے والے ہیں۔

بائبل نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے اس کا اندازہ ان عبارتوں سے کیجئے جو
ابھی پڑھ کر سنار ہاہوں :-

”خداوند خدا نے..... عورت سے کہا اپنے خیم کی طرف تیرا شوق ہوگا“

اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا“ (پیدائش باب، آیت ۱۶)
یہ عبارت عہد عتیق کی تھی یعنی توریت کی، اب جدید یعنی انجیل کی بھی سینے۔

”اے بیویو! اپنے شوہروں کی ایسی تابع رہو جیسی خداوند کی،

کیونکہ شوہر بیوی کا سر ہے، جیسے مسیح کلیسا کا سر ہے، اور وہ خود بدن کا

بچانے والا ہے، لیکن جیسے کلیسا مسیح کا تابع ہے، ایسے ہی بیویاں ہر بات

میں اپنے شوہروں کی تابع ہوں“ (افسیون باب، آیات ۲۲-۲۳) ۱

قرآن حق کا کلام ہے اور ہمیشہ حق ہی کہتا ہے، وہ کلیسا کی کونسلوں اور نمونہ کی طرح عورت کی تحقیر و تذلیل کا ہرگز قائل نہیں، لیکن ساتھ ہی جاہلیت قدیم اور جاہلیت جدید سے بھی ہمدردی نہیں۔ وہ عورت کو ٹھیک وہی مقام دیتا ہے جو غلط کائنات نے اسے نظام کائنات میں دے رکھا ہے۔ بحیثیت ایک عبد اور مکلف انسان کے وہ مرد کے مساوی اور ہم سطح ہے لیکن دنیا کے انتظامی معاملات میں مرد کے ماتحت و تابع ہے۔

آخر میں یہ طور اسباب قرآن نے دو باتیں بیان کی ہیں، ایک یہ کہ مرد کو عورت پر فوقیت طبعی و تکوینی پسلیہ سے حاصل ہے۔

بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ، اور مرد کی یہ فضیلت اس کے ذوال جہانی کی مضبوطی اور ذوال دماغ کی برتری کے باعث ہے۔ اور دوسرے یہ کہ مرد جو عورت کا مہر اور نفقہ کے سلسلے میں خرچ کرتا رہتا ہے۔

بِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ، یعنی مرد کو فضیلت دہری حاصل ہے۔ ایک تو طبعی یعنی جہانی و دماغی قوی میں خلقی برتری کے باعث دوسرے قانونی یا معاشرتی۔ یعنی عورت خرچ میں مرد کی دست نگر رہتی ہے۔ یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ قرآنی نظام میں کماتا یا کسب معاش کرنا یا بیوی کے خرچ کا بار اٹھانا مرد کے ذمہ ہے۔ قرآن اس

نظام معیشت کو پسند نہیں کرتا، جس میں کما کر لانے کی راہیں میاں بیوی دونوں کے لئے
یکساں کھلی ہوئی ہوں۔ ۱۔

پہلے ۴۱: —————

اس سیاق میں قرآن نے اسے بھی کھول کر بیان کر دیا ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ
میں کس قسم کی بیویاں خاتونیں چاہتا ہے۔

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (آیت ۳۴)

سونیک بیویاں اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں اور پیچھے پیچھے حفاظت کرنے
والیاں اللہ کی عنایت سے،

سب سے شروع میں جو حرف آتا ہے یا بے معنی نہیں۔ ف کے معنی
ہیں ”نتیجہ“ یعنی اور اوپر کے مقدمات سے یہ نتیجہ لازم آجاتا ہے کہ وہ نیک بیویاں
ایسی ہوں کہ کیسی ہوں؟ پہلی بات یہ کہ وہ اللہ کی فرمانبرداری اور عبادت گزار تو ہوتی ہیں
شوہروں کی بھی فرمانبرداری و اطاعت گزار ہوں۔ مساوات کے نعرے لگانے والیاں ہوں۔
اور دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ شوہروں کی غیبت میں ان کی عزت و ناموس کی اور ان کے
مال و اولاد کی حفاظت کرنے والیاں ہوں۔

یہ حال تو ہوا، شریف، شائستہ، مہذب بیویوں کا، جیسا کہ ہونا چاہیے۔ اب میں
ناشائستہ اور ذلیل فطرت والیاں تو ان کی بھی جھلک دیکھ لیجئے:

وَالَّذِي تَخَافُونَ نُشِوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ

فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ۝

اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم ان کی سرکشی کا عالم رکھتے ہو تم انہیں نصیحت کرو۔

اور انہیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو اور انہیں مارو۔

یہاں آیت میں جو لفظ خوف آیا ہے (تَخَافُونَ نَفْسُ زَهْنٌ) تو یہاں اس کے مراد محض شبہ یا گمان نہیں بلکہ یہ ہے کہ جب ان کی بغاوت و نافرمانی تجربہ میں آجائے ابن عباس رضی صحابی کی تفسیر خوف و بمعنی علم آیا ہے۔ تخافون اہی تعلمون اور دوسرے اہل تفسیر بھی اسی طرف گئے ہیں کہ محض بدگمانی کافی نہیں بلکہ وہی تجربہ قصور کا ہو لے۔ اور نشوز کے معنی یہ ہیں کہ بیوی شوہر کی نافرمانی پر کمر بستہ ہو جائے۔ جب پُر مسرت از دواجی زندگی کا گھر بغاوت و تصادم کا تماشا گاہ بن جائے، تو اس وقت کے لئے پہلا حکم ہے کہ عِظُوْهُنَّ انھیں سمجھاؤ، و خطا و پند سے کام لو، عورت اگر شریف طینت ہے تو یقین سے کہ اس نرمی و آشقی کے طریقے سے اصلاح پر آجائے گی، اور اس ضمن میں یہ ہدایت بھی مل گئی کہ غصہ میں آکر کوئی فوری کارروائی نہ کر بیٹھو۔ لیکن جب یہ تدبیر کارگر نہ ہو تو اب علی قدم یہ اٹھاؤ کہ ترک ہم بستری کرو۔ بلکہ ہجر کے معنی یہاں ابن عباس رضی صحابی اور متعدد تابعین سے ہجر الکلام منقول ہیں۔ یعنی ترک کلام۔ ان سے بولنا چھوڑ دو، اور جب سزا کا یہ دوسرا درجہ بھی ناکام رہے، تو انھیں جسمانی آزار پہنچا سکتے ہو۔ یہ آخری تدبیر صرف آخری درجہ میں ہے۔ جب پہلے دونوں علاج تجربہ کے بعد ناکام ثابت ہو لیں۔ اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ٹلے قسم کی ہو جس سے نہ چوٹ زیادہ آئے اور نہ اس سے رفیق زندگی کی کی توہین لازم آئے۔ بلکہ مفسر صحابی ابن عباس رضی کی تو رائے ہے کہ یہ مار سواک کی سی ہلکی چھلکی چیز سے ہو، قرآن مجید کا خطاب ظاہر ہے (لیکن بار بار یاد کر لینے کی ضرورت ہے)۔ کسی ایک طبقہ سے، کسی ایک بلندی ترقی پر پہنچی ہوئی قوم سے نہیں، اس کے مخاطب ایک ہی وقت عرب و عجم بھی، اور حبشی و مصری بھی، ہندی و چینی بھی، امریکی و افریقی بھی، بڑے سے بڑے شریف بھی اور انتہائی رذیل بھی، چار اور چھوٹے بھی، عالم و فہیم بھی، جاہل و کودن بھی، ہر طبقہ، ہر ذہنیت، ہر اخلاقی و عقلی سطح کے لوگ

پہلی صدی ہجری سے لے کر قیامت تک، ہر زمانہ اور ہر سطح تمدن والے ہیں، اور اس لئے اس کے احکام میں احاطہ ہر انسانی اور ہر بشری ضرورت کا کر لیا گیا ہے اور یہ مشاہدہ ہے کہ آج بھی تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی ایسے طبقے اور معاشرے موجود ہیں جہاں عورت کے لئے گالی گلوچ اور جسمانی سزائیں عام ہیں۔ مارپیٹ کوئی نادر الوقوع واقعہ نہیں، پھر انھیں بھی اس کی اجازت ضرورت پڑنے ہی پر ہے۔ ختمائے اُمت نے صاف کہہ دیا ہے کہ نرم تدابیر اگر کام دے جائے تو سخت صورت کی اجازت نہیں۔ اور قرآن مجید کا سیاق بھی نرمی ہی کی سفارش کر رہا ہے۔ یورپ میں جہاں میاں بیوی کی مارپیٹ کا رواج ہے۔ اس کا ذکر خاکسار کی انگریزی تفسیر میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں اس اجازت کا موجود ہونا ہرگز اس کے حق میں مضرت نہیں بلکہ یہ تدعین دلیل ہے اس کی کہ قرآن مجید کے احکام ہر طبقہ، ہر مزاج، ہر سطح انسانی کے لئے تھے اور ہیں۔

—: (۴۲) —:

مصلو بہت شرح کی بحث قرآن مجید کی اہم بحثوں میں سے ہے۔ اور مسیحیت کے عقیدہ و اختلاف نے اسے اہم تر بنا دیا ہے۔ اس کے سمجھنے اور گتھی کے پوری طرح سلجھنے میں ذرا وقت لگے گا۔ لیکن یہ وقت ان شاء اللہ ضائع نہیں ہوگا۔ بس ذرا صبر و تدبیر سے سماعت فرمائیں۔

قرآن مجید نے اسے کسی مستقل عنوان کے ماتحت نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی ایک لمبی فہرست جرائم میں محض ضمتا بیان کر رہا ہے۔ اور پورا مضمون ایک آیت میں نہیں، دو تین آیتوں میں آیا ہے۔ سورۃ النساء کا بائیسواں رکوع کھول کر ملاحظہ کیجیے، دو لمبی آیتوں میں قوم اسرائیل کی تاریخی نافرمانیوں اور مسلسل سنگین جرائموں کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

فَبِمَا نَقَضْتُمْ مِيثَاقَهُمْ وَكُفِّرْتُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلْتُمُ
الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ طَبَعَ
اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُدْعُونَ إِلَّا لِقَائِ اللَّهِ (آیت ۱۵۵)

سو ہم نے انھیں سزا میں مبتلا کیا، یہ سبب ان کی غمہ شکنی کے، اور یہ سبب
آیات الہی سے ان کے کفر کے، اور یہ سبب ان کے خون ناحق انبیاء کے
اور یہ سبب ان کے اس قول کے کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں (نہیں) بلکہ
ہے یہ کہ اللہ نے ان ہر مہر لگا دی ہے یہ یہ سبب ان کے کفر کے، سو وہ ایمان
نہیں لائے مگر بہت تھوڑا سا۔

اور وہ تھوڑا سا ایمان، ناقص، نامکمل، لغوی معنی میں جو ہے، وہ مرتبہ ایمان شرعی کے لئے
کافی نہیں۔

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا (آیت ۱۵۶)

اور یہ سبب ان کے کفر کے اور یہ سبب ان کے قول کے مریم پر بہتان عظیم کے۔

یعنی اور سب تو ان کی نافرمانیاں چل رہی تھیں، اب اس میں اضافہ انھوں نے یوں کیا کہ اس
پاک سرشت مریم بنت عمران پر ایک سخت گندہ الزام لگا دیا، قرآن مجید نے اس گندہ الزام
کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا، باقی یہود کی کتابوں میں تو اس شرمناک جرم کی صراحت
آج تک کبھی چلی آ رہی ہے۔ یہود کی لکھی جو قدیم ترین حیات سچ

کے نام سے عبرانی میں موجود ہے، اس کا انگریزی ترجمہ ACCORDING

TO HEBREWS کے نام سے چھپ چکا ہے، اس میں اس رومی سپاہی کا نام

مک دیا ہے جس کے ساتھ نعوذ بالشر آپ کو شہم کیا ہے اور یہ نام بیسویں صدی کی ایک کتاب

جو زون کلازمر *elohesom* کی *LIFE OF JESUS* مک میں

نقل ہوا ہے۔

والدہ مسیح پر بہتان عظیم کے بعد قرآن مجید کہتا ہے ان کی مسلسل سزایابی کے لئے کہ
 وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ (آیت ۱۵۷)
 اور یہ سب ان کے اس قول کے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو مار ڈالا جو اللہ کے
 پیغمبر تھے۔

اس وقت یہود اس کو اپنی ہی جانب منسوب کرتے تھے، اور اس کو اپنا ایک
 پُر فخر کار نامہ سمجھتے تھے۔ حکومت اس وقت ملک پر گو یہود کی نہیں، رومیوں کی تھی۔
 فوجداری عدالتیں بھی انھیں کی تھیں، سزا دینے اور سولی پر چڑھانے کا اختیار بھی یہود کو
 نہیں، انھیں کو تھا، یہود تو عام رعایا کی طرح تھے۔ لیکن قرآن مجید نے یہ قول منسوب انھیں
 کی جانب کیا۔ مقدمہ عدالت میں یہود ہی لائے۔ گواہ استغاثہ کی طرف سے یہود ہی پیش
 ہوئے، اور آپ کو سزا دلوانے میں پوری سہی یہود ہی نے کر ڈالی، بلکہ جب سزا دینے میں
 رومی حاکم عدالت پلاٹس *Platters* مذہب ہونے لگا تو شور و شر اس کے
 خلاف برپا کر کے اسے سزا دے موت سنانے پر مجبور کر دیا۔
 انجیل متی میں ہے:

”جب پلاٹس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا، بلکہ اکٹا بلوہ ہوا جاتا ہے
 تو پانی لے کر لوگوں کے رو برو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں راستہ بھڑکے
 خون سے بڑی ہوں، تم جانو۔ سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اولاد کی
 گردن پر، اس پر اس نے برا بکیران کی خاطر چھوڑ دیا۔ اور سیورٹ کو کوڑے
 لگا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ (باب ۲۷، آیات ۲۳-۲۶)
 اس سے ملتے جلتے بیان انجیل مرقس وغیرہ کے ہیں، اور انجیل لوقا میں تو یہ صریح
 بھی موجود ہے کہ:-

”مگر پلاٹس نے یسوع کو چھوڑنے کے ارادے سے پھر ان سے کہا، لیکن

وہ چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دے۔ صلیب! اس نے عیسوی باران سے
 کہا، کیوں؟ اس نے کیا بُرائی کی، میں نے قتل کی کوئی وجہ نہیں پائی اور میں
 اسے پٹا کر چھوڑ دیتا ہوں۔ مگر وہ چلا چلا کر سر ہیرتے رہے کہ اسے صلیب
 دی جائے، ان کا چلا ناکارگر ہوا۔ پلاٹس نے حکم دیا کہ ان کی مرضی کے موافق ہو
 یسوع کو ان کی مرضی کے موافق سپاہیوں کے حوالہ کیا۔ (باب ۲۲، آیات ۲۱ تا ۲۵)
 اور انھیں یہود سرداروں اور عالموں ہی نے قریح کو عدالت تک پہنچایا تھا۔
 انجیل مرقس میں ہے:-

”اور فی الفور مسیح جو تھے ہی سردار کاہنوں نے بزرگوں اور نصیبوں اور سارے
 عدالت والوں سمیت صلیب کمرے یسوع کو بندھوایا اور لے جا کر پلاٹس کے
 حوالہ کیا۔“ (باب ۱۵، آیت ۱)

اور خود انجیلوں میں جو پیش خیریاں حضرت مسیح کی زبان سے اپنے قتل یا شہادت
 کی بابت ہیں ان میں بھی سبقت اور پیش قدمی یہود ہی کے سرداروں کی دکھائی ہے، رومی
 یا رومی حکومت کا نام بھی نہیں لیا ہے۔
 انجیل متی میں ہے:-

”اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور
 ہے کہ میں یروشلم کو جاؤں، اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور نصیبوں کی طرف سے
 بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں“ (باب ۱۶، آیت ۲۱) ۱
 اور انجیل مرقس میں ہے:-

”پھر وہ انھیں تسلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے
 اور بزرگ اور سردار اور فقیہ اسے روکیں اور اسے قتل کیا جائے“ (باب ۱۶، آیت ۳۱)
 اور انجیل لوقا میں ہے:-

”ضرور ہے کہ ابن آدم دکھا اٹھائے، بزرگ اور سردار کا ہن اور فقیہ

اسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے۔“ (باب ۴ - آیت ۲۳)

نورِ حقیقت یہ قرآن کی انتہائی حقیقت سنجی کا ثبوت ہے کہ اگرچہ مقدمہ پیش ہوا رومی عدالت میں اور رومی ہی عدالت نے آپ کو سزا اے موت کا حکم سنایا، لیکن قرآن مجید نے مجرموں میں صرف یہود کا لیا کہ حقیقت میں ان ہی کا ہاتھ قدم قدم پر کام کر رہا تھا۔ یہود کا فخر یہ قول کہ ”ہاں ہم ہی نے عیسیٰ بن مریم کا کام تمام کر ڈالا“ ابھی ابھی نقل ہوا ہے۔
ب دیکھیے قرآن ان کے اس قول پر کیا تبصرہ کرتا ہے،

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ

”حالانکہ وہ نہ آپ کو مار ڈال سکے، نہ آپ کو سولی پر چڑھا سکے، بلکہ ان پر شبہ

ڈال دیا گیا۔“

یعنی آپ کا کام تمام کر ڈالنا تو الگ رہا (وَمَا قَتَلُوهُ) وہ تو آپ کو سولی پر بھی چڑھانہ پائے۔ (وَمَا صَلَبُوهُ) اور اس آخری فقرہ کے اگر یہ معنی لیے جائیں کہ ”آپ کو سولی پر نہ مار سکے“ تو آپ کی ہلاکت کی نفی سرے سے پہلے ہی فقرہ میں کر دی ہے تو یہ دوسرا فقرہ صلیب پر مار نہ سکے بالکل بے کار یا حشو ہوا جاتا ہے یعنی جب آپ کسی کو کسی طرح نہ مار سکے تو اس میں سولی دینا بھی شامل ہو گیا۔ پھر اب اس کے دہرانے کی کیا ضرورت تھی، اور قرآن مجید حشو سے بالکل پاک ہے۔ صَلَبُوهُ کا اصل مفہوم مھن سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کا ہے۔ چڑھا کر ختم کر دینے کا نہیں۔ امام لغت الغب کے مفردات میں ہے تعلیق الانسان للقتل انسان کو ہلاکت کے لئے لٹکا دینا اور دو میں یہ مفہوم ”سولی دینے سے نہیں“ ”سولی پر چڑھانے“ ہی سے ادا ہوتا ہے۔ اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادر دہلوی اور حضرت تھانوی کے اردو ترجموں میں اس کی رعایت موجود ہے۔

حضرت مسیح کے ملک اور زمانے میں سرکاری سزائے موت کے لئے طریقہ ہی صلیب پر چڑھانے کا نافذ تھا۔ تو قرآن کہتا ہے کہ یہود آپ کو ہلاک تو کیا کرتے، سوئی پر چڑھانے پر بھی قادر نہ ہو سکے۔ بلکہ دھوکے میں پڑ گئے۔ اور حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ یہ شبہ میں کیوں پڑ گئے؟ یا حقیقت کس پر مشتبہ و متلط ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ وہی یہودیابی ہر ا مراد میں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ مدارک میں ہے وقع علیہم الشبہ اور بیضاوی میں ہے التباس علیہم الامر۔ مایوں کہا جائے کہ شبہ انھیں مقتول سے متعلق ہوا یا اس کی شخصیت کے بارے میں وہ دھوکے میں پڑ گئے جلالین میں ہے شبہ لہم المقتول والمصلوب۔

قرآن نے اس اشتباہ یا التباس کو خوب ہی مؤکد کیا ہے، اندر نفی ہلاکت کو ایک بار پھر صراحت سے دہرایا ہے:

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا (آیت ۵۸)

اور جو لوگ آپ کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں اور آپ کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس کوئی علم (صحیح تو ہے نہیں۔ ہاں بس یہ گمان کی پیروی ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ انھوں نے آپ کو ہلاک نہیں کیا۔

غرض اس پر ہمارے سارے مفسرین کا اتفاق ہے کہ دھوکا یہود کو ہوا اور وہ حضرت مسیح کے بجائے کسی اور کو سوئی پر دیے گئے۔ یہ شخص کون تھا؟ اور اس دھوکے کی کیا صورت ہوئی، اور ایک بڑے مجمع کے سامنے یہ دھوکا ممکن کیونکر ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا تصریحی جواب نہ قرآن مجید میں ہے، نہ حدیث صحیح میں۔ سادہ دل مسلمان کو تو محض اس صورت حال پر جو کہ یہاں بیان ہوئی ہے، ایمان لے آنا کافی ہے اور چون و چرا میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن آج کے طالب علم کو جو فکر کیسے اور کیونکر کی پیدا ہوئی

اس کی تسکین کے لئے لازمی ہے کہ اس تاریخی گریڈ کا جواب تاریخ ہی کی روشنی میں دیا جائے۔
واقعے کے ایک ایک جزئیہ کو سامنے لے آیا جائے۔ اور جو صورت واقعہ سبب سے زیادہ
قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال ہو۔ اس کو اللہ کا نام لے کر ترجیحی طور پر اختیار کر لیا
جائے۔ کڑی کا سلسلہ کڑی سے اُبھرنے نہ پائے۔ اس کے لئے کچھ دیر کے صبر و سکوت
کی درخواست ہے۔

(ا) سب سے پہلی بات تو اس سلسلے میں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یروشلیم
کے لوگوں سے ملنے جلتے کم تھے۔ آپ کی کم آسیر می کا نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی
آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے۔ چنانچہ آپ کی گرفتاری کے وقت اکابر یہود اور مستعد
سپاہیوں کا گروہ شناخت کے لئے کافی ثابت نہ ہوا، بلکہ آپ کی شناخت کے لئے آپ ہی
کی مختصر پارٹی سے ایک غدار کو توڑ لینا پڑا۔ یہ حقیقت ہے تو خالص تاریخی، لیکن کرامت
دیکھیے کہ آپ کے امام المفسرین امام رازیؒ (جن کا زمانہ ساتویں صدی ہجری کے شروع کا ہے)
اس راز سے واقف نکلے، چنانچہ لکھتے ہیں:

والناس ما كانوا يعرفون المسيح الا بالاسم لانه
كان قليل المخالطة بالناس (کبیر)

لوگ حضرت عیسیٰ کو تو بس نام ہی سے جانتے تھے۔ ان کی کم آسیر می کی بنا پر۔
متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم
کے بزرگوں کی طرف سے ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاثلیاں لئے ہوئے سپاہیوں کی
شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لئے انھیں یہود ارمنافق کا سہارا ڈھونڈنا
پڑا۔ اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ ملیں اور پیادے وہاں پہنچے تو۔

”یسوع نے ان سے پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو تو وہ بولے یسوع ناصری کو۔

یسوع نے جواب دیا کہ میں تم سے کہ چکا ہوں کہ میں ہی ہوں“ (باب ۱۸ آیت ۱۷)

حضرت سحی کا یہ تعظیمی خیال تو بہت بعد کی پیداوار ہے، معاصر مخالفین و معاندین کے نزدیک تو آپ کی حیثیت بس ایک بدنام و غیر متعارف مجرم کی تھی، وہ سامنے موجود تھا، اور اپنے کو چھپا بھی نہیں رہا تھا۔ ظاہر کر رہا تھا۔ اس پر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

۲۔ دوسری بات یہ خیال رکھنے کی ہے کہ بہ طور خرق عادت یا بطور کمالی فن حضرت کو تبدیل ہئیت میں خاص لکھ تھا۔ انجیلوں میں اس خصوصیت کو بہ طور معجزہ بیان کیا گیا ہے۔ انجیل متی میں ہے:

”پچھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں ایک اونچے پہاڑ پر لے گیا۔ اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی۔ اور اس کا چہرہ سورج کے مانند چمکا“ (باب ۱، آیت ۲) اور انجیل لوقا میں ہے:-

”جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرے کی صورت

بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی۔“ (باب ۹، آیت ۲۹)

(۳) تیسرے اس حقیقت کا بھی استحضار کر لیا جائے کہ ملک فلسطین کی آبادی، اس وقت اسرائیلیوں (یہود) کی تھی۔ عام رعایا یہی لوگ تھے۔ لیکن ملک کی حکومت رومیوں کی تھی۔ اور عمدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی، اور رومی نہ صرف مذہباً مشرک تھے، عقیدے میں اسرائیلیوں سے مختلف، بلکہ شکل و شمائل، قیافہ اور چہرہ ہرہ، وضع و لباس، زبان و معاشرت ہر چیز میں یہود سے ایسے ہی مختلف تھے جیسے ابھی کل تک انگریز ہندوستان میں رہنے کے باوجود ہندوستانیوں سے تھے۔ اور جس طرح ہندوستانیوں کو سب گورے بھانے معلوم ہوتے تھے، اور جس طرح گوروں کو سارے کالے ایک نظر آتے تھے اسی طرح سب بدیسی رومیوں کو کل اسرائیلی ایک ہی سے

دکھائی دیتے تھے۔

(۴) اب چوتھی گڑی اس سلسلے میں یہ ملائیے کہ جس مقام پر عدالت تھی وہاں کے سولی گھر فاصلہ پر تھا۔ اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی کے بڑے حرف T یا ریل کے سگنل سے مشابہ ہوتی تھی۔ یہ پوری اس سولی گھر میں گڑی نہیں ہوتی تھی۔ صرف اسکی سیدھی لمبی کھڑی بتی سولی گھر میں گڑی رہتی تھی۔ اور جو لکڑی اس کے اوپر عرض میں آڑی پڑتی تھی۔ وہ وہاں نہیں، بلکہ عدالت میں رکھنی رہتی تھی۔ اور دستور یہ تھا کہ اسے خونی مجرم اپنی پیٹھ پر لا کر سولی گھر تک لاتا۔

یہاں تک جو کچھ عرض ہوا، اسے پوری طرح ذہن میں رکھ کر صورت واقعہ نظر کے سامنے لائیے۔ اور آگے پڑھیے۔

وہ دن جمعہ کا تھا (GOOD FRIDAY) کا اتوار آج تک اس کی یادگاریں منایا جاتا چلا آرہا ہے) حکم جب سنایا گیا تو دن آخر ہو رہا تھا۔ یہود کو جلدی تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے ہر طرح فراغت پا کر اور مجرم کو دفن کر کے شاموں شام گھر واپس پہنچ جائیں۔ ان کا یوم السبت جمعہ کی شام ہی سے شروع ہو جاتا تھا اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی و تدفین وغیرہ بھی ممنوع تھی۔ اور پھر یہود کا اہم ترین عید فصح (Passover) بھی شروع ہونے کو تھا۔ غرض کہ یہود کو اس کی بڑی عجلت تھی کہ کسی طرح ان کا مجرم جلد سے جلد سولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔

باتوان و لاغر مجرم (حضرت عیسیٰ) کے لئے ممکن نہ تھا کہ پشت پر اتنی وزنی گڑی لا کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں۔ خصوصاً جب کہ یہودی بچے اور خود یہود انھیں قدم قدم پر چھیڑتے جاتے اور ان کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے۔ انجیل میں ورس دو دنوں میں ہے کہ براہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر ان پر لعن و طعن کرتے۔ بلکہ دوڑا کو مجرم جو ساتھ۔ تھے وہ بھی اس میں شریک رہے۔

اس ساری صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ نظر کے سامنے لا کر خود سوچئے کہ
 رومی سپاہی جو حاکم قوم کے افراد تھے اور مجرم کو اپنی حراست میں لئے ہوئے تھے۔ انھوں
 نے اس موقع پر کیا کیا ہو گا؟۔۔۔۔۔ خود اپنے اوپر تو وہ نئی کا بوجھ لادنے سے ہے۔
 انھوں نے وہی کیا جو ایسے موقع پر کوئی ان کا سا انسان کرتا۔ انھوں نے راہ ہی میں سے
 کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب والی لکڑی اس پر لاد دی۔ یہ محض قرینہ ظن قیاس
 نہیں۔ انجیلوں میں اس کی تصریح ملتی ہے۔

”انھیں شمعون نامی ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بیگار پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے۔“

(متی باب ۲۷، آیت ۳۱) /

ایک حوالہ یہ ہوا، دوسرا اور لیجئے:-

”اور شمعون نامی ایک کرینی آدمی، سکندر اور افس کا باپ، دیہات سے
 آتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ انھوں نے اس کو پکڑ لیا کہ اس کی صلیب اٹھائے“ (مرقس ۱۶: ۳۱)

تیسرا حوالہ اور ملاحظہ ہو:-

جب اس کو لئے جانے تھے، تو انھوں نے شمعون نامی ایک کرینی جو دیہات سے
 آتا تھا پکڑ لیا، صلیب اس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے (لوقا ۲۳: ۲۶)
 اچھا، اب جب یہ عوام الناس کا ہجوم اس افراق فزی کے ساتھ ایک دوسرے کو
 ریتا پیتا، مجرم سے پھیر ڈھانی کرتا، اس سے تسخر کرتا، سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا، تو رومی
 پولیس کا جو گارڈ ہمراہ تھا، اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اب عمل دخل جیل کے وارڈوں، سنتریوں کا
 شروع ہوا۔ وہ کیا جانے کہ یسوع ناصری کس کا نام ہے، خدائی یا پیمبری کا وعیدار کون ہے۔
 وہ مجرم حسب دستور، اس کو سمجھے جس کی پشت پر صلیب لادی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر اس نفسیاتی
 حقیقت کا استحضار کر لیجئے کہ جیل کے رومی، سنتریوں کے لئے سب اسرائیلی (جنہی ہی تھے۔ اور اس
 لئے سب آپس میں ہم شکل، ان کے لئے ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی

(شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ بالکل قدرتی تھا۔ انھیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق محسوس ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً داویلا چایا ہوگا، لیکن ادھر ہجوم کا شور و ہنگامہ، ادھر رومی سنتریوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت، اور پھر سولی پر چڑھا دینے کی جلدی، اس آفراتفری کے عالم میں شمعون اسرائیلی کو مجرم سمجھ کر سولی پر چڑھا دیا گیا۔ وہ جینا چلاتا رہا۔ اور حضرت مسیح اس ہڑ لونگ میں یقیناً رہا ہو گئے، اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوئیں مارتے رہے۔ وَلٰكِنْ شَيْئًا هُمْ کی تفسیر اس سے بڑھ کر روشن تر اور کیا ہوگی۔

آخر میں یہ بھی سن لیجئے کہ یہ عقیدہ بالکل نو ایجاد نہیں، خود مسیحوں ہی کا ایک قدیم فرقہ باسلیدیہ (Basildian)۔ (بانی فرقہ کا سال وفات سن ۱۳۰ء) اس عقیدہ کا قائل ہوا ہے، اور کھلم کھلا کہتا تھا کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے۔

قرآن مجید اس عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ لیکن پولوس (متوفی سن ۶۵ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی، اس کی بنیاد ہی عقیدہ کفارہ پر ہے۔ یعنی اس پر کہ ابن اللہ نے، یا خود خدا نے مجسم ہو کر، اور مصلوب ہو کر جانکشی کی تکلیف اٹھا کر، اور اپنی جان دے کر ساری گنہگار مخلوق کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا۔ اس لئے رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیح کے ایک قدم کے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ اور اسی لئے لامحالہ اس پولوسی اور تمام تریٹلیشی مسیحیت میں کل قدیم تر اور صحیح عقیدہ مسیحی فرقوں کو "مبتدع" و بدوین قرار دے کر دائرہ مسیحیت سے القط کر دیا، اور خود وہی کہنے لگے جو دشمنان مسیح یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے۔ یعنی کہ عیسیٰ صلیب پر وفات پا گئے۔ گویا ہرے کہ اس اشتراک عقیدہ میں نہیں دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں۔ یہود ہلاکت مسیح کو موقع تحقیر و اہانت پر بیان کرتے ہیں، اور مسیحی بنفسہ اس واقعے سے آپ کی عظمت، بلکہ

الوہیت پر دلیل لاتے ہیں۔ نفس و فات بہر حال دونوں میں مشترک ہے۔
 سچ کہا قرآن نے کہ مسیح کے بارے میں یہ لوگ یعنی اہل کتاب آپس کے اختلاف
 میں لپٹے ہوئے ہیں، کوئی آپ کو عرش الوہیت پر بٹھائے دیتا ہے اور آپ کی خدائی کا
 کلمہ پڑھ رہا ہے، کوئی مرتبہ نبوت بلکہ ولایت و مقبولیت سے بھی نیچے اتار لاتا ہے، اور
 آپ کو نعوذ باللہ شعبہ باز قرار دے رہا ہے اور قرآن نے یہ جو آپ کے متعلق فرمایا ہے
 کہ یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ۔ تو شک کی بہترین تفسیر
 مفسر تھانویؒ نے کی ہے: قول بلا دلیل، یہ قول بلا دلیل ہی کی برکت تو ہے کہ نظریہ
 پر نظریہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں، اور کوئی بات بنائے نہیں بنتی۔ مسیحی مسیحیوں کے دست
 گریبان میں، اور یہود یہود سے۔ دیکھتے دیکھتے، اندر رہی اندر خدا معلوم کتنے فرقے
 نکل آئے ہیں، ایک دوسرے کو جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زود

اسی موقع کے لئے ہے۔ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ، اور علم سے مراد علم ثابت بالدلائل
 ہے۔ تحقیق سے تہی دستی کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ نہ کوئی نص اسکی خیالی راہوں
 کی پشت پر ہے، نہ کسی نص سے استنباط صحیح۔ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ : ظن یہاں
 مقابل میں علم کے ہے۔ یعنی کوئی دلیل نہ عقلی نہ نقلی ہے۔

وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا۔ مار کے لے کر جلا لیں تک سب کا اس پر اتفاق ہے
 کہ یہ فقرہ نفی قتل و ہلاکت کی تاکید کے لئے ہے۔ چوں کہ عقیدہ وفات مسیح یا قتل مسیح
 بہت بڑی گمراہی کا باعث ہے۔ اور دنیا کے دو بڑے مذہب حیت اور یہودیت
 اسی غلط عقیدہ میں پڑے ہوئے ہیں، اس لئے قدر شا قرآن کو ضرورت بھی اسکی تردید
 کی، اس وضاحت و تاکید کے ساتھ، پیش آئی۔

—: (۴۳) :—

قرآن مجید نے عقیدہ کے سلسلہ میں بڑا زور تسلسل وحی پر دیا ہے، یعنی اسلام دنیا کے لئے کوئی جدید یا نوپیدا مذہب نہیں ہے۔ اور نہ رسول اسلام دنیا میں پہلے شخص میں جن پر وحی آئی ہے، بلکہ نزول وحی کا سلسلہ دنیا میں بہت قدیم سے چلا آ رہا ہے، اور دنیا کے مختلف جہتوں میں اور مختلف زمانوں میں پیسہ برابر پیدا ہوتے ہی رہے ہیں، جنہوں نے اللہ کے کلام کی منادی کی ہے، اور اللہ کا کلام بندوں تک پہنچا یا ہے۔ چنانچہ اسی سورہ نساء میں بڑے زور اور صفائی کے ساتھ اس ضمن کو بیان کیا ہے، اور نبیوں کے نام تک صراحت سے دے دیے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ
مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ
وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَى وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَ
هَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا (آیت ۱۶۳)

یقیناً ہم نے آپ پر (اسے پیسہ) وحی بھیجی، جیسی وحی ہم نے بھیجی نوح اور ان کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی، اور ہم نے ابراہیم اور اسمعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اسباط اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان پر بھیجی۔ اور ہم نے داؤد کو ایک صحیفہ دیا تھا۔

روائے سخن زیادہ تر یہودی ہی کی جانب سے اور عقلاً حجت انہیں پر قائم کی ہے کہ جب تم حضرت نوح کے بعد بہت سے نبیوں کو جانتے ہو اور مانتے ہو، اور نظام وحی کے پوری طرح قائل ہو، تو ایک نئے نبی کی شناخت و معرفت سے تمہیں اتنی وحشت اور دشواری کیوں ہو رہی ہے۔ نبیوں کے نام لینے کے بعد ذکر ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ
نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا (آیت ۱۴۴)

اور دوسرے پیغمبروں پر بھی وحی بھیجی تھی کہ ان کا حال ہم آپ سے پیشتر بیان
کر چکے ہیں، اور ایسے پیغمبروں پر بھی کہ ان کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں

کیا، اور موسیٰ سے اللہ نے خاص طور پر کلام فرمایا۔

اس میں اس بات کا اثبات ہے کہ ایسے پیغمبر بھی ہوئے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں
آیا ہے۔ اور ہمیں سے یہ مسئلہ ہمارے متکلمین نے اخذ کیا ہے کہ ہر ہر نبی پر تفصیل کے ساتھ

نام بہ نام ایمان لانا ضروری نہیں، بلکہ سب نبیوں کی اجمالی تصدیق ضروری ہے، اور حضرت

موسیٰ علیہ السلام کا ذکر جس انداز کے ساتھ آیا ہے یعنی فعل کے بعد پھر اسی مصدر کو لانا،

وہ بھی تنوین کے ساتھ، عربی کے اسلوب بلاغت کے مطابق، اس سے کلام کی کوئی خاص

حیثیت اور خصوصیت رکھتا تھا۔ ورنہ محض کلام و مخاطبہ تو عام معنی میں ہر ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہی

رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِشَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى

اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (آیت ۱۴۵)

پیغمبروں کو (ہم نے بھیجا) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے

(بنا کر) تاکہ لوگوں کو پیغمبروں (کے آنے کے) بعد اللہ کے پاس عذر باقی

نہ رہ جائے، اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست، بڑا حکمت والا۔

ان پیغمبروں کے آنے کی غرض و غایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ نیکی اور اجر و ثواب کے

اور بدی و عذاب کے راستے لوگوں کے علم و نظر میں رکھیں اور وحی الہی کی روشنی میں انہیں وہ درس

دیں جہاں تک عقل و دماغ کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور پیغمبروں کے آجانے کے بعد اب

کسی کو قیامت میں یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ رہا کہ ہماری عقل مساکل و حقائق کے سمجھنے

سے قاصر تھی۔ اور متکلمین نے ہمیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ بندوں پر حجت اللہ کی طرف سے

ارسالی رسل اور بعثت نسبیا کے بعد ہی قائم ہوتی ہے نہ کہ مجرّد عقل و فہم کی بنا پر۔
چنانچہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اسے تکرار کے ساتھ لکھا ہے +
اور اخیر آیت میں جو دو خطاب الہی عزّیز و حکیم آئے ہیں، تو یہ یاد دلانے
کے لئے کہ وہ عزّیز یا غالب گل تو مالک و مختار اور فاعل حقیقی کی حیثیت سے حق اور
اختیار رکھتا تھا کہ پیغمبروں کے بھیجے بغیر ہی، ہر عذر قطع کر دیتا۔ لیکن اس حکیم کی شان
حکیمانہ نے یہ چاہا کہ وہ ظاہری عذر بھی باقی نہ رہنے دے +

—: (۲۲) :—

یہود کے ذکر سے فارغ ہو کر ختم سورہ کے قریب ایک بار پھر اثبات توحید و
تردید تثلیث کے مضمون کو، زور و قوت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہود جس طرح تفریط
کے مریض ہیں، عیسائی افراط کی انتہا پر پہنچ گئے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ مسیح کو بجائے ایک
صالح اور مقبول برگزیدہ پیغمبر کے، خدائی کے درجے پر پہنچا دیا تھا۔
ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى
اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ
رَسُولُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ ۖ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ
مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انْتَهُوا
خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللّٰهُ إِلَٰهٌ ۚ وَاحِدٌ ۚ سُبْحٰنَهُ ۚ أَن
يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۚ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ
وَكُفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا ۚ (آیت ۱۷۱)

سرے اہل کتاب، دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ کے بارے میں کوئی بات

حق کے سوا نہ کہو، مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے ایک پیغمبر ہی ہیں اور اس کا
 کلمہ جسے پہنچا دیا تھا اللہ نے مریم تک، اور ایک جان ہیں اس کی طرف سے
 بس اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ، اور یہ نہ کہو کہ (خدا) تین ہیں
 (اس سے) باز آجاؤ، تمہارے حق میں یہی بہتر ہے، اللہ تو بس ایک ہی معبود
 ہے، وہ پاک ہے اس سے کہ اس کے بیٹا ہو۔ اُس کا ہے جو کچھ آسمانوں
 میں اور زمین میں ہے اور اللہ ہی کا، کارساز ہونا کافی ہے۔

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ
 الْمُقَرَّبُونَ ۖ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ
 فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا (آیت ۱۷۲)

اور مسیح ہرگز اس سے عار نہ کریں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور نہ مقرب
 فرشتے۔ اور جو کہ اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا، اللہ
 سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔

اپنے دین میں غلو نہ کرو، یعنی افراط نہ قفريط۔ ٹھیک صراطِ مستقیم پر قائم رہو۔
 مرشد تھا نوئی فرماتے تھے جس طرح یہود کا غلو، احکام ظاہری میں تعمق تھا، اور مسائل
 باطنی کی طرف سے اعراض اسی طرح عیسائیوں کے غلو میں، مسائل باطن میں تعمق اور
 ظاہر کی طرف سے اعراض۔ طریق حق، ظاہر و باطن کو جمع کرنا ہے۔

اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو، یعنی الوہیت کے باب میں کوئی
 فیصلہ اپنی رائے سے گڑھ نہ پیش کرو۔ اور توحید میں کوئی شبابہ بھی شرک کا نہ آنے دو۔
 اور مسیح ابن مریم کی حقیقت بھی بس اسی قدر ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول تھے
 جیسے اور بہت سے رسول گزر چکے ہیں، نہ کہ خدا، یا مظهر خدا، یا فرزند خدا۔ اللہ کے رسولوں
 اور اس کے بھیجے ہوئے قاصدوں کو معبودیت یا نیم معبودیت پر پہنچا دینے کا مرض مشرک

قوموں میں کثرت سے رہا ہے۔ عیسائیوں نے بھی مصری شرک اور یونانی درودی مشرک
نظام سے متاثر ہو کر اپنے پیغمبر برحق کو، منظر خدا اور فرزند خدا قرار دے دیا، رہا ان کا
کلمۃ اللہ ہونا، تو اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ان کی پیدائش اللہ کے ایک کلمہ ہی کا
نتیجہ ہے، اور خود کلمہ سے مراد کلمہ کُن ہے، جو بہ واسطہ جبریل علیہ السلام حضرت مریم پر

القار ہوا۔

رُوحٌ مِّنْهُ، یعنی اللہ کی طرف سے اللہ کی بنائی ہوئی ایک رُوح، جو بہ واسطہ
فرشتہ جبریل، اور بلا اسباب ظاہری و مادی، حضرت مریم کے بطن میں مجسم ہو گئے۔ اور کلمہ اور
رُوح کا انتساب اللہ کی جانب محض اس تعلق کے شرف و عظمت کے اظہار کے لئے ہے جیسے
خانہ کعبہ کو بیت اللہ کہتے ہیں، حالانکہ اللہ کے گھر سب ہی ہیں۔ قرآن ہی میں ایک ترکیب
نِعْمَةٌ مِّنَ اللَّهِ کی آئی ہے۔ حالانکہ جو نعمت بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے تو ہوتی
ہی ہے۔

رُوحٌ مِّنْهُ سے مراد یہ نہیں کہ اللہ کی رُوح صرف انھیں میں تھی، اور کسی فرد بشر
میں نہیں ہوتی۔ اللہ کی رُوح تو ہر فرد بشر میں ہوتی ہے۔ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِيْ
قرآن مجید میں مقام تخصیص و امتیاز پر کسی کو سجدہ کے سے تعبیر کیا گیا ہے، اور کسی کو عبدنا
سے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اللہ کے بندے سب ہی ہیں۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ، یعنی اللہ کے پیروں پر ایمان لاؤ۔ پیروں ہی کی
تعلیم کے مطابق۔ اور فَاٰمِنُوْا کی ف میں یہ اشارہ ہے کہ ان صحیح حقائق کو سمجھ لینے
کے بعد اب واجب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد اور خیالات کو چھوڑ کر ایمان اللہ کے
رسولوں کی صحیح ہدایات پر لاؤ۔

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةً : تین نہ ٹھہراؤ، اللہ بس ایک ہی ہے۔ تین اقنوم، تین مستقل بالذات
ہستیاں۔ تین کسی معنی اور کسی حیثیت سے بھی نہیں۔ تثلیث کا گورکھ دھندا جس طرح عیسائیوں

کتابوں میں درج ہے ہماری آپ کی، شاید سب ہی کی فہم سے بالاتر، وہ انھیں کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ اور اگر آپ سُن چکے ہیں تو دوبارہ سننے کا لطف حاصل فرمائیے۔

”باپ، بیٹے، روح القدس کی اُویہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر۔“

عظمتِ ازلی یکساں۔ جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا، اور ویسا ہی روح القدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق، اور روح القدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود، اور روح القدس غیر محدود۔ یوں ہی باپ ازلی، بیٹا ازلی اور روح القدس ازلی۔“

تاہم تین ازلی نہیں، بلکہ ایک ازلی، اسی طرح تین غیر محدود نہیں، اور تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔

باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق۔ تو یہ بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق۔

ویسا ہی باپ خدا، بیٹا خدا، روح القدس خدا۔ اس پر تین خدا نہیں، بلکہ ایک خدا۔ کہاں توحید کا سادہ عام فہم کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اور کہاں تثلیث کا یہ گورکھ دھندا خدا کا صحیح رشتہ بندہ کے ساتھ صرف الکیٹ کا ہے۔ مالک و مملوک کے درمیان بُبائیت لازمی ہے۔

برخلاف اس کے دلہ اور مولود کے درمیان بجا نیست یعنی ہم جنسی وہم نوعی شرط ہے تو جب ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے تو کوئی بھی مخلوق اس کی اولاد نہیں ہو سکتی۔

اور عقیدہ ولایت غلط ہی نہیں بلکہ عقلاً مہمل ہے۔ تنزیہ الوہیت کے لئے باعث

توہین اور شان الوہیت کے لئے بالکل منافی ہے۔

وَكُفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا، اس حقیقت کے اظہار سے شرکوں پر یہ سوال قائم

کر دیا کہ کیا خدا کو بندوں کی حاجت روائی اور اپنی کارسازی میں کسی کی اعانت کی محتاجی ہے

جو وہ کسی کو شریک کرے۔

پھر اگلی اُمت میں ملائکہ مقربین کا عطف مسیح پر بہت معنی خیز ہے۔ ایک طرف ملائکہ مقربین اور دوسری طرف حضرت مسیح۔ یہی دو تو دنیا میں کثرت سے جُجے ہیں بشر کو نے فرشتوں کو دیوی دیوتاؤں کے نام دے کر شریک الوہیت کر لیا، اور سمجھوں نے مسیح کو خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔ اسی لئے خصوصیت کے ساتھ تصریح ان دونوں کی نفی الوہیت کی گئی۔ اور بتایا گیا کہ اللہ کی عبدیت، کوئی چیز تو ہین والی نہیں۔ مسیح اور ملائکہ مقربین تو اس پر فخر کرتے ہیں، نہ یہ کہ اس سے شرمائیں، یا کسی قسم کا بھی ننگ محسوس کریں۔ مرشد تھانویؒ نے اس موقع پر فرمایا کہ مراتب شرف میں عبدیت مرتبہ اعلیٰ ہے اور بیان کو ختم اس قانون پر کیا ہے کہ اللہ کی بندگی میں کوئی عار محسوس ہی کیسے کر سکتا ہے، جب اللہ ایسا حاکم مطلق ہے، کہ کیا فرشتے اور کیا پیغمبر سب ہی کو اس کی خدمت میں حاضری دینا ہی ہے۔

— (۲۵) پینچہ —

سورہ نائدہ کے چھٹے رکوع کے آخر میں تاکید ہے کہ تقویٰ الہی اختیار کرو، اور اس پر اعتماد و توکل اختیار کرو۔ اس کے متعا بعد بنی اسرائیل کا ذکر آتا ہے اور تاریخی استناد کے طور پر بیان ان کے قبیلوں کا ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ (آیت ۱۶)

اور بیشک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کئے تھے، اور ان سے کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

لیکن پہلے تقویٰ کی قرآنی اصطلاح کا مفہوم یہاں سمجھ لیا جائے۔ قرآن مجید میں بار بار اشار صراحتیں اس مضمون کی ملتی ہیں کہ دنیوی غلبہ و کامیابی میں بڑا دخل تقویٰ کو رہتا ہے۔

قناعت، بے طمع، بے نفسی، جذبات پر قابو، صداقت شکاری، عدل، خود داری، غیرت مندی، حفظ حدود، غرض سیرت و کردار کی ساری ہی خوبیاں، کیا انفرادی، کیا اجتماعی، اس ایک جامع لفظ تقویٰ کے اندر آ جاتی ہیں۔

اس کے بعد شہادت ایک متحد قوم بنی اسرائیل کی پیش ہوتی ہے کہ جب تک انھیں اطاعت و فرمانبرداری کے احکام، ان کے پیروں کے واسطے پہنچائے گئے، ان سے احکام کا عہد لیا گیا، اس وقت تک ان کا غل بھی ان کے قول کا ساتھ دیتا گیا۔ اور جب انھوں نے عہد شکنی کرنا اپنا شیوہ بنالیا، تباہ و برباد ہو گئے۔

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا، یہ اسرائیلی سردار تعداد میں ان کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق تھے۔ ہر ہر قبیلہ کا ایک ایک سردار۔ اور تورات کا بیان اس کے بالکل مطابق ہے۔ کتاب گنتی (۱-۱۱) کے پہلے باب میں ہے کہ مصر سے اسرائیلیوں کے نکلنے کے دوسرے برس خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”بنی اسرائیل کی ساری جماعت کا مطابق ان کے فرقوں کے اور ان کے

آبائی خاندانوں کے امم شماری کے ساتھ ہر ایک مرد سے سرگن کر حساب کرو اور ہر فرقہ پر ایک ایک آدمی، ہر ایک جو اپنے خاندانوں کا سردار ہے، تمہارے ساتھ ہو۔“ (آیت ۲-۴)

آگے ان سرداروں کے درج ہیں، اور وہ تعداد میں بارہ ہیں۔ اور پھر اسی تورت میں ایک دوسری جگہ کنعان و فلسطین پر فوج کشی سے ذرا قبل کے موقع پر ہے:

”خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج، تاکہ کنعان کی زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں، جاسوسی کریں، ایک ایک مرد جو اس کے آبائی فرقہ میں سے، جو اس میں سردار ہے، بھیج دے۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشت فاران میں ان کو بھیجا۔ وہ سب لوگ بنی اسرائیل

کے سردار تھے۔

یہاں بھی سرداروں کی تعداد بارہ ہی درج ہے۔

وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ : اس شرط اطاعت پر، اس جزاء معیت الہی کا ترتیب اب کیا بتایا جائے، کہ ایک موحّد و خدا پرست قوم کے لئے کس درجہ بہت آفریں و شوق افزا ہو سکتا ہے! دل اس کے بعد کس قوی و مطمئن ہو جاتا ہے، اور شکست کا کوئی احتمال بھی اس کے بعد ان کے سامنے نہیں آ سکتا۔ آج کوئی وزیر یا گورنر، رعایا کے کسی فرد سے کہہ دے کہ گھبراؤ نہیں، ہم خود تمہارے ساتھ ہوں گے، تو اس کا دل کتنا بڑھ جائے اور کتنا حوصلہ اسے حاصل ہو جائے۔ چہ جائیکہ یہاں خالق کائنات، مالک الملک، حاکم علی الاطلاق، اپنی معیت کا یقین دلارہا ہے! تسکین و اطمینان کی کوئی منزل اس کے بعد باقی رہ جاتی ہے؟

یہ ایک پہلو تھا، اب دوسرے پہلو سے دیکھیے کہ کیا معیت بندے کے اس استحضار معیت الہی کے بعد ممکن ہے؟

کسی بزرگ و مقبول بندہ کی نگرانی تو ہوائے نفس کو روک دیتی اور نفس پر ایک بریک لگا دیتی ہے، چہ جائیکہ ہمہ بین، ہمہ داں، ہمہ خواں، مالک و مولیٰ کی معیت کا استحضار! غرض ترغیب و ترمیم کے جس پہلو سے بھی دیکھیے، یہ معیت الہی کا مراقبہ بہترین و مؤثر ہی ہے۔ یہ ہمارے محققین نے صاف ہی کر دیا ہے کہ معیت کے مراد معیت جسمانی تو ہو ہی نہیں سکتی، جیسی مخلوق مخلوق کے درمیان ہوتی ہے، بلکہ یہ معیت، احاطہ علم و قدرت و تصرف کے لحاظ سے ہے۔

—: پیچہ (۴۶) :—

اور اسی سورۃ المائدہ میں جزم کے ساتھ مسیحیت اور اس کی ایک خاص شکل کی تکفیر، جزم و قطعیت کے ساتھ ہے۔ مسیحیت کی اکثر صورتیں تو کھلے ہوئے کفر و شرک کی ہیں

بعض شاخوں نے اور غلو کر کے یہ مسلک اختیار کر لیا تھا کہ مسیح، خدا یا منظر خدا کیسے، وہ تو عین خدا ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ (آیت)

بے شک وہ لوگ کافر تو ہو گئے تھیں نے کہا کہ خدا ہی تو عیسیٰ ابن مریم ہے۔

اصل عیسیٰ عقیدہ جو پرستش و کیتھولک، سارے مسیحی فرقوں میں مشترک ہے۔

اس کے اصل الفاظ اس خطبہ میں کچھ منٹ قبل آپ سن

چکے ہیں، جس میں تینوں انتہیوں کی الوہیت، ازلیت، غیر مخلوقیت، قدرت مطلقہ، غیر موجودیت

ایک بتائی گئی ہے۔ کیا کوئی شرک اس سے بڑھ کر کھلا ہوا بھی ممکن ہے؟

اب قرآن ان کے اس دعویٰ پر جرح کر رہا ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ

الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَآلَهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (آیت)

اچھا تو آپ کہئے، کون کچھ بھی بچا سکے ہے اللہ سے اگر وہ ہلاک کر دینا چاہے

مسیح ابن مریم کو، اور ان کی والدہ کو، اور جو کوئی بھی زمین میں ہے ان سب کو۔

ساری ملکیت و مالکیت تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ارادہ میں کوئی بھی حائل و

مانع ہو سکتا ہے؟ حتیٰ کہ مسیح بھی اور ان کی والدہ محترمہ بھی، باوجود اپنی صالحیت، مقبولیت

اور بلندی مرتبہ کے! اور ساری دنیا میں مل کر بھی اس کی ملکیت اور مالکیت باہر کہیں جاسکتی ہے؟

— تو جب صورت حال یہ ہے تو اسے مسیح پرستوں کو کس منہ سے مسیح اور والدہ مسیح کے شرک

الوہیت ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ —

مسیح کے ساتھ والدہ مسیح کا نام یہاں لے آنے کا کھلا ہوا راز یہ ہے کہ مسیحوں کی

ایک بڑی آبادی، کروڑوں کی تعداد میں حضرت بی بی مریم کو بھی خدائی میں حصہ دار عقین کر رہی

ہے۔ یہ عقیدہ، عقل اگر بالکل ہی ماری نہیں گئی ہے، تو بجز شرک صریح گئے اور کیا ہے؟ اور

اسی عقیدہ مریم پرستی کے لئے اگر حوالوں کی تلاش ہو تو اس خاکسار کی انگریزی تفسیر کے مطالعہ کی زحمت گوارا فرمائیے۔

اور آگے سنئے ! :

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ
مَا يَشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (آیت ۲۰)

اور اللہ ہی کی حکومت ہے، آسمانوں اور زمین پر اور جو کچھ ان کے درمیان

ہے۔ وہ جو کچھ چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔
یعنی ساری موجودات پر اور ساری کائنات پر حکومت تو اکیلے اسی کی ہے، بلا کسی کی شرکت
و اعانت کے۔ اور بے اختیاری، بے بسی اور عجز محض میں جیسے کل دنیا ویسے ہی حضرت
مسح اور ان کی والدہ بھی۔ اس اعتبار سے اس میں ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔ پھر تمہیں کیا
ہو گیا ہے کہ انہیں خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیتے ہو !

آیت کا آخری ٹکڑا معنویت سے لبریز ہے۔ اللہ جو چاہے، اور جس طرح چاہے
پیدا کر دے۔ مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح کی پیدائش چونکہ بن باپ کے ہوئی
ہے، اس لئے انہیں عام بشر یا محض انسان کیسے تسلیم کیا جائے۔ وہ یقیناً فوق البشر
تھے اور الوہیت میں حصہ دار۔ جواب اسی کا ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ تو ہر چیز کی تخلیق پر

قادر ہے، چاہے بھی جس طرح ہر سنت عادی و عمومی کے مطابق بھی اور اس کے
مخالف بھی۔ اس کی قوت خلاقی کسی صورت و طریق کے ساتھ مقید و محدود نہیں اور
وہ تخلیق کی ہر نوع اور ہر صنف پر قادر، بلا واسطہ ہو یا بہ واسطہ سب اسکی قدرت کے
آگے ہٹے۔ اور وہ سب پر یکساں قادر۔ تو اس بنیاد کو بھلا کیا پیش کرتے ہو ؟

————— پیڑ ۴۷ —————

ایک بڑی معرکہ کی بحث یہ ہے کہ جس طرح ہمارے دس میں متحدہ خاندان ایسے ہیں

جو اپنے کو دیوتا زادے سمجھتے ہیں اور کوئی چند نفسی کہلاتے ہیں، یعنی چاند زادے، اور کوئی سورج نفسی، یعنی سورج زادے۔ اسی طرح اہل کتاب انبیاء زادوں کا خزانہ مالی نفسی حدود سے تجاوز کر کے خدا زادے ہونے تک پہنچ رہا تھا۔ اب قرآن میں اسی مقدمہ کی روداد ملاحظہ ہو:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصْرَانِي نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاءُ كَ (آیت ۱۲)

یہود اور نصرانی کہتے ہیں کہ ہم خدا کی اولاد اور اس کے چہیتے ہیں۔

اور اپنے اس قولی سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ اس لئے ہم اور انسانوں سے کہیں امتیاز فضل بھی ہیں

نَحْنُ صِیْغَةُ جَمْعٍ مُتَّكِلَةٍ مِّنْ مَّا مَرَادُ أَفْرَادٍ مِّنْهُمْ، بَلْ كَقَوْمٍ يَّالُمُتْ تَحْتَهُ بِعِنِیْ مِّنْ حِیْثُ الْقَوْمِ اور نصرانی بہ اعتبار ملت۔

موجودہ بائبل میں ان کے خزانے آج تک لکھے چلے آ رہے ہیں :

”خداوند نے یوں فرمایا کہ اسرائیل میرا بیٹا، بلکہ پلوٹھا ہے“ (کتاب خروج باب ۴، آیت ۲۲)

”تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو“ (کتاب استثناء، باب ۱، آیت ۱)

یہ حوالے توریت کے تھے، اور جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد ۴، ص ۹۵ پر انھیں عقائد

کی تکرار کی موجود ہے۔ رہی انجیل، تو اُس میں بھی اسی طرح کی عبارتیں آج تک لکھی چلی رہی ہیں۔

”جنتوں نے اسے قبول کیا تو اُس نے انھیں خدا کا فرزند ہونے کا شرف بخشا“ (یوحنا باب ۱، آیت ۱۲)

أَبْنَاءُ (جمع ابن کی) سے مراد حقیقی صلبی بیٹے نہیں۔ اس کے لئے عربی میں دُکرا

لفظ ہے۔ وَلَد۔ ابن کا اطلاق مجازی مُنہ بولے لڑکوں پر پوری طرح ہوتا ہے،

اور عربی میں اس کا یہ مجازی استعمال کثرت سے اور بہت عام ہے، امام لغت راغب

اصفہانی نے اس کی بہت سی مثالیں اپنے لغت میں جمع کر دی ہیں۔ ابن اسیر، ابن اللیل

ابن اسلم، ابن الیوم وغیرہ۔ اور دوسرے اہل لغت نے لکھا ہے کہ اب اور ابن اور

یہ من لفظ ایسے ہیں کہ بڑی کثرت سے وہ کسی کی جانب منسوب ہو کر استعمال ہوتے ہیں، اور ایسے ناموں کی ایک پوری فہرست دے دی ہے جو عربی میں بعض اسماء معرفہ و مذکرہ کے لئے چلے ہوئے ہیں۔ مثلاً ابن لطفین، یعنی حضرت آدم، ابن اللیل یعنی چور، ابن الاقوال یعنی باتونی شخص وغیرہ۔

ہمارے مفسرین نے (الشران پر رحمت کرے) بلا اس کے کہ بائبل کے مجاہدوں کی کوئی خصوصی مطالعہ کیا ہو، محض اپنے اشراق ایمانی سے یہی معنی قرار دیے ہیں۔ تفسیر کبیر و مدارک وغیرہ میں انھیں نقل بھی کیا ہے کہ ہم خاصان خدا ہیں، خاصان خدا کی اولاد ہیں، اس لئے خود بھی خاصان خدا ہیں شامل ہیں، اور ہمارا اور عام خلقت کا مقابلہ ہی کیا۔ حال انکی تقریروں کا یہی تھا کہ ہم خاصان خدا اور مقربین حق میں ہیں۔ وہی ذہنیت جو آج مسلمانوں میں بھی کتنے پیرزادوں، بزرگ زادوں، مخدوم زادوں کی ہے۔ قرآن اس عقیدہ پر زندگاتا ہے:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَنِعَرِّمٍ
خَلَقَ ۖ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ (آئدہ، ع، آیت ۲)

آپ کہہ دیجئے کہ تو پھر خدا تمھیں گناہوں پر سزا کیوں دیتا ہے۔ نہیں، بلکہ تم (محض بشر ہو) اس کی مخلوقات میں سے۔ وہ جسے چاہے گناہ بخشے گا اور جسے چاہے گناہ عذاب دے گا۔

یعنی بلا کسی استثناء و امتیاز کے۔ اس کا قانون جزا و سزا تو عام ہے، اور وہی تمھارے لئے بھی ہے

اور وہی حاکم برحق اور قادر مطلق یہ وعدہ کر چکا ہے کہ اہل ایمان کے لئے مغفرت ہے اور اہل کفر کے لئے دائمی عذاب۔ بد اعمالی پر سزا تو ایک مشاہدتی حقیقت ہے جس کے کسی کو مجال انکار نہ تھی۔ اور دنیوی سزاؤں کے تذکرہ سے تو عہد متیق کے صحیفے بھرے پڑے ہیں۔ انھیں کی طرف یہود اور نصرا نیوں کو توجہ دلائی ہے کہ قانون مجاہدات و مکافات بھلا

کسی کی رود عاریت کرتا ہے۔ عذاب سے بچنے پر تمہارا اپنی بزرگ زادگی پر تکیہ رکھنا کیا
معنی رکھتا ہے؟

—: پیڑ ۴۸: —

بنی اسرائیل کی تاریخ اور یہود کے اعمال و عقائد کا بیان قرآن مجید کے خصوصی
موضوعوں میں سے ہے اور بار بار آیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں ایک جگہ ذرا نئے انداز
میں ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ ادْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ
عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ
مَّا لَمْ يُوْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝ (آیت ۲۴)

اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! اللہ کا
وہ احسان تم اپنے اوپر یاد کرو، جب اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کئے
اور تمہیں خود مختار بنایا، اور تمہیں وہ دیا جو کسی قوم کو بھی نہیں دیا گیا تھا۔

حضرت موسیٰ اپنی قوم کو اللہ کے دُہرے احسان یاد دلارہے ہیں۔ ایک یہ کہ پیغمبر
انہیں کی قوم کے درمیان اُٹھتے رہے۔ فیکم یہاں مِنْكُمْ کے معنی میں ہے یعنی تمہاری
قوم کے درمیان نعمت نبوت رکھ دی اور نبوت چونکہ ایک مرتبہ شخصی و انفرادی ہوتا ہے اس
لئے قرآنی بلاغت نے یہاں قید ”تمہارے درمیان“ کی لگا دی۔ اور دوسری نعمت بادشاہت
ملوکیت یا مملکت کی ہے۔ چونکہ یہ قومی و اجتماعی ہے، اس لئے بلا کسی قید یا تخصیص کے اسے
بلا کسی مِنْكُمْ یا فیکم کے، یہاں محض جَعَلَكُمْ کہہ دیا۔

اس نکتہ پر نظر، قرآن کے ہر طالب علم کی خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں اور وہ
مسلم ہو یا غیر مسلم، ضرور پڑنا چاہیے، اور عبارت کی اس دقیقہ ری کی پوری قدر کرنا چاہیے۔
مُلُوكًا کا ترجمہ اس میں آپ کو خود مختار بنایا جا رہا ہے۔ عربی میں مَلِک کا مفہوم

بڑا وسیع ہے، محض بادشاہ یا تاجدار تک محدود نہیں۔ ہر آزاد، خود مختار، صاحبِ حیثیت شخص پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لغت و تفسیر دونوں میں اسے صاف کر دیا گیا ہے۔ اور حدیث میں ایسے شخص پر مَلِک کا اطلاق آیا ہے، جو اپنا ذاتی مکان اور خادم رکھتا ہو، تفسیر ابن جریر طبری میں ہے:

عن زید بن اسلم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم
من كان له بيت وخادم فهو مَلِكٌ —

اور تفسیر قرطبی میں ایسی کے مثل روایت نقل ہوئی ہے اور خود قرآن مجید کی سورۃ البقرہ رکوع ۳۰ میں مَلِک سردارِ فوج کے معنی میں آیا ہے، اَبْعَثْ لَنَا مَلِکًا نَقَاتِلُ۔ بلکہ جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد ۵ ص ۵ سے پتہ چلتا ہے کہ اہل فلسطین کے محاورہ میں تقریباً ہر سردار بادشاہ ہی کہلاتا تھا۔

حضرت موسیٰ کی یہ تقریر ہے اس زمانہ کی، جب بنی اسرائیل مصر کی غلامی سے آزاد ہو کر جزیرہ نماے سینا میں آزادی سے نقل و حرکت کر رہے تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جو ایک ہی وقت میں دینی رہبر و پیر بھی تھے اور دنیوی لیڈر اور سردار بھی۔ ان سے مطالبہ کر رہے تھے کہ اپنے وطن فلسطین چلو اور ظالم و فاسق قومِ عالمانہ کو نکال کر وہاں حکومت کرو۔ تازہ تاریخی، اثریاتی، معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ مصر سے ہجرت کرنے والی بنی اسرائیل کا زمانہ ۱۳۰۰ ق م کا ہے اور فلسطین پر بنی اسرائیل کی فوج کشی کا زمانہ ۱۲۰۰ ق م کا ہے۔ حساب سے حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ اسی درمیانی مدت کا ہے، بلکہ عجیب نہیں کہ آپ کی عمر کے بالکل آخر حصہ کا زمانہ ہو۔ توریت کے صحیفہ استثناء کے باب اول سے بھی کچھ لیا ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو اسی صحیفہ استثناء ہی میں تصریح بھی موجود ہے کہ آپ نے یہ تقریر دریاے یردن کے کنارے اپنے واقعہ خروج مصر کے چالیسویں سال کے کیا۔ یوں مہینہ کی پہلی تاریخ کو ارشاد کی تھی۔

اور یہ شبہ نہ گزرے کہ اسرائیل کو بادشاہت اس وقت تک کہاں ملی تھی۔ فتح کنعان (فلسطین) ہی اس کے بعد ہوئی۔ اور داؤد و سلیمان کی بادشاہتوں کا زمانہ تو اس کے صدیوں بعد کا ہے۔ لفظ **مَلِک** کی تشریح ابھی چند منٹ قبل آپ کے سامنے گزر چکی، اور بالفرض اگر کسی کو **ملوک** کے معنی بادشاہ لینے پر اصرار ہی ہو، وہ یہ سن لے کہ قرآن اپنے زور بیان میں جو واقعات مستقبل میں پیش آنے قطعی و یقینی ہوتے ہیں انھیں برابر صیغہ ماضی میں بیان کر جاتا ہے۔ بادشاہت بنی اسرائیل کی یقینی تھی۔ اور اس کے یقینی ہی ہونے کی بنا پر اسے بجائے مستقبل کے صیغہ ماضی سے ادا کر دیا گیا۔

تقریر کی بیان کی ہوئی 'ذو نعمتوں' نبوت و ملوکیت کی تشریح ہو چکی تیسری نعمت ابھی باقی ہے۔

وَالشُّكْرُ مَالًا يُؤْتِي أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ : تمہیں وہ چیز عطا کی ہے جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دی گئی تھی، یعنی دولت توحید، مذہبی حیثیت سے۔ انھیں خطبات میں دو ایک مقام پر یہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ دولت توحید میں حیث القوم اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص رہی ہے۔ دوسری قومیں اور نسلیں شرک میں پڑی رہا کی ہیں۔ اور قوم اسرائیل شروع ہی سے اس شرف و فضل سے مشرف رہی ہے۔ ہمارے مفسرین کو (اللہ ان پر رحمت فرمائے) ایک عجیب دشواری اس مضمون کی آیتوں میں ہمیشہ پیش آتی رہی کہ اگر سب کے اشرف و افضل نسل اسرائیل کو مان لیا جائے تو پھر اُمت محمدی کے لئے کون سا مقام باقی رہ جائے گا۔ اشکال اور دشواری کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہے۔ مقابلہ تو یہاں دنیا کی قوموں اور نسلوں کا ہو رہا ہے اور ان میں سب کے اشرف و افضل نسل اسرائیل ہی ہے۔ یعنی بجائے مشرکانہ خرافات، وہم پرستوں کے عقیدہ توحید اور اس کے لوازم رسالت و وحی، ملائکہ، حشر و نشر وغیرہ کی حامل ہی ایک قوم رہی ہے۔ لیکن اُمت محمدی نام کسی نسل یا قوم کا کب ہے؟ اس کی بنیاد تو بجائے نسل و نسب کے صرف عقائد صحیحہ پر ہے، اور

اسرائیلی ہو کر اسماعیلی، عرب ہو کر عجم، حبشی ہو کر حبشی، گورا ہو کر کالا ہو، مغربی ہو کر مشرقی، جو کوئی بھی توحید و رسالت کا کلمہ پڑھنے لگے، بس وہی امت محمدی میں داخل و شامل ہے خاتم النبیین کی نبوت جس طرح سلسلہ انبیاء کی خاتم ہوئی ہے، قومی و نسلی برتری کی بھی قاطع ہے ۱۷

—: ۲۹۹ :—

قرآن فہمی میں ایک بڑا مانع، ہم اُردو دانوں کے لیے، یہ آپڑا ہے کہ جو الفاظ عربی اور اُردو میں مشترک ہیں، انھیں قرآن میں بھی، اُن کے اُردو ہی مفہوم میں سمجھ لیا گیا ہے کہیں کہیں تو بیشک اشتراک لفظی کے ساتھ معنوی بھی ہے لیکن کثرت سے یہ ہے کہ لفظ اصلاً آیا تو اُردو میں عربی ہی سے، لیکن اپنا مفہوم پورے کا پورا اپنے ساتھ نہ لایا کہیں کچھ تھوڑا سا مفہوم لے کر آیا، اور باقی وہیں چھوڑ آیا۔ اور کہیں ایسا بدرا کہ یہاں آکر پھیل گیا، اور وہ مطالب اپنے اندر پیدا کر لئے جو عربی داں کے خیال میں بھی نہ آئے۔ اور کہیں تسکلی اور وسعت دونوں سے الگ ایک نیا ہی مفہوم پیدا ہو گیا۔ لفظ ”وسیلہ“ اور لفظ ”جہاد“ بھی ایسے ہی ہیں، جن کا اُردو مفہوم ان کے عربی مفہوم سے بالکل جدا گانہ ہے اور اس کی مثال سورۃ المائدہ ہی کی اس آیت میں مل جاتی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ
وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (آیت ۴۰)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کا قرب حاصل کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو، تاکہ تم ہر طرح فلاح پاؤ۔

عربی میں وسیلہ کے معنی قرب یا نزدیکی کے ہیں۔ ابن جریر طبری، قرطبی، ابن قتیبہ سب نے یہی معنی لئے ہیں۔ یہی معنی متعذبات البعین، مجاہد حسن، قتادہ، عطار وغیرہ نے نقل ہوئے ہیں۔ اور قرب حق کا بہترین وسیلہ احکام الہی کی تعمیل ہے۔ ابن عباس صحابی نے کہا ہے:-

اطلبوا الیہ القرب فی الدرجات عند اللہ۔

اور تفسیر کبیر میں ہے :

فالمراد طلب الوسيلة الیہ فی تحصیل مرضاتہ و ذلک
بالعبادات والطاعات۔

اور وسیلہ سے مراد رضیات الہی کی طلب و تحصیل ہے۔ عبادتوں اور طاعتوں
کے ذریعے۔

ہمارے اہل جن لوگوں نے وسیلہ کے تحت میں بزرگوں سے استعانت اور
اولیاء اور انبیاء سے استغاثہ جائز رکھا ہے، انہوں نے عربی کے وسیلہ بمعنی قرب کو، اُردو کے
وسیلہ بمعنی ذریعہ کا مراد سمجھ لیا ہے۔ اور ایسی شدید فاحش غلطیوں کی مثالیں شاذ نہیں
کثیر الوقوع ہیں۔ علامہ آلوسی بغدادی، صاحب روح المعانی نے تفصیل سے اس موضوع پر
کلام کیا ہے اور لکھا ہے کہ :

”مدیئت یا غائب شخص سے دعا کرانے کے ناجائز ہونے میں کسی بھی عالم کو شک
نہیں، اور یہ ایسی بدعت ہے جس کا ارتکاب سلف میں سے کسی نے بھی نہیں کیا
ہے۔ حضرات صحابہ سے بڑھ کر نیکی اور ثواب کا حریص اور کون ہو اسے۔ لیکن کسی ایک
صحابی سے بھی منقول نہیں کہ اس نے صاحب قبر سے کچھ طلب کیا ہو۔“

آخر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

”حضرت عبداللہ ابن عمر کا، اتباع سنت تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے
لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ جب روضہ نبوی پر حاضری دیتے تو صرف اس قدر کہتے
کہ السلام علیکم یا رسول اللہ، السلام علیک یا ابا بکر، السلام علیک
اور اس سے زائد کچھ نہ کہتے، نہ کچھ مانگتے۔ نہ سرورِ عالم سے اور نہ ان کے
کرمِ مقربین سے۔“

اور وسیلہ کی طرح عربی لفظ جہاد کو بھی لوگوں نے اُردو کے جہاد کے معنی میں لے رکھا ہے۔ اُردو میں جہاد ایک دینی اصطلاح کی حیثیت سے قتال فی سبیل اللہ کے معنی رکھتا ہے، اور اسی کے لئے مخصوص و محدود ہو چکا ہے۔ عربی میں یہ صرف و قید کچھ بھی نہیں۔ عربی میں جہاد کا مفہوم بہت وسیع و عام ہے۔ ہر سخت کوشش جو کسی بھی دینی غرض سے کی جائے۔ خصوصاً دشمنانِ دین کے مقابلہ میں جہاد ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جہاد جس طرح میدانِ رزم میں تیرو تفتنگ سے ہو سکتا ہے، اسی طرح بزمِ مال و دولت سے اور زبان و قلم سے بھی ہو سکتا ہے۔

اور انھیں دُعا اعلیٰ، ایک طلبِ قرب، اور دوسرے جہاد پر ترتیبِ فلاح کا ہو جانا ہے۔ اور اخیر میں خوش خبری ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ، تاکہ تم فلاحِ یاب ہو جاؤ اور فلاح کے تحت میں دنیا و آخرت کی ہر کامیابی اور ہر کامرانی آگئی۔

— ﴿۵۰﴾ —

تبلیغ کی دین میں جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ قرآن میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔ ایک مقام اسی طرح کا، اسی سورۃ المائدہ میں ہے۔ اور بہت معنی خیز ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ (آیت ۲)

اے ہمارے پیغمبر پہنچا دیجئے جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اُتر رہا ہے، اور اگر یہ آپ نے نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیام پہنچایا ہی نہیں۔ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ یقیناً اللہ کافروں کو راہ نہ دے گا۔

پہلے اندازِ خطاب دیکھیے، آیہٴ الرَّسُولِ تبلیغ کے موقع پر اور اس کے سیاق میں یہ خطاب

خود ہی کتب تبلیغ و حکیمانہ ہے۔ گو اسے مخاطب تمھاری تو حیثیت ہی تمام تر رسول کی ہے پام
پہنچانے والے کی ہے۔ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ ذِكْرٍ مِّن قُرْآنٍ مَّجِيدٍ كَاسَارِ
ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ باقی جو چیزیں وحی خفی کے راستہ سے رسول اللہ کو تعلیم ہوئی تھیں وہ
بھی اس عموم کے اندر شامل ہیں۔ ابن عباس صحابی سے یہی معنی منقول ہیں، اور فقہائے
مفسرین میں سے قرطبی، عیاض اور نسفی اسی طرف گئے ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ
آپ نے کوئی بات بھی اگر چھپائی تو رسالت کا حق ہی نہیں ادا کیا۔ اس میں رد اگیا ان
اہل باطل کا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ نعوذ باللہ، رسول نے اُمت کو قرآن پورے کا پورا
نہیں پہنچایا، بلکہ کسی خوف یا کسی مصلحت سے اُسے کسی قدر ناقص صورت میں پہنچایا ہے۔
درحقیقت یہ ہے بھی مرتبہ رسالت سے بہت ہی گری ہوئی بات کہ پیغمبر جیسا عبد کامل
کوئی حکم شریعت کسی کی مردت یا کسی کے دباؤ سے چھپا جائے، اور عائشہ صدیقہؓ نے کسی
لطیف اور سچی بات اس موقع پر کہی ہے کہ اگر آپ نے کوئی بھی جزو قرآن کا چھپایا ہوتا
تو وہ یہی ہوتا۔ اور اگر یہ کہئے کہ قرآن نے اس درجہ مستبعد مفروضہ کو آپ کی جانب منسوب ہی
کیسے کیا، تو قرآن نے تو محالات عادی بلکہ محالات عقلی تک کا ذکر و بیان قرآن ہی میں کر دیا ہے۔
مثلاً تاکید توحید کے سلسلہ میں ایک کے بجائے دو خداؤں کا فرض کرنا، اور اس حکم کو اور
مؤکد بنانے کے لئے تہقین کے لہجہ میں ارشاد ہوتا ہے: وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔
اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، آپ تشویش و فکر نہ کریں۔ یہ آپ کو ہرگز ہلاک
کرنے پر قدرت نہ پاسکیں گے۔ اور یہاں یہ سوال نہ کیجئے کہ جب محفوظیت کا وعدہ ہو چکا
تھا تو پھر جنگ اُحد میں جسم مبارک کو جراثیم کیسے پہنچیں۔ مفسروں نے یہ سوال پیدا کر کے جواب
اپنے اپنے رنگ کا دیا ہے۔ لیکن سب کے صاف اور بے تکلف جواب مفسر تھانویؒ کے قلم سے
نکلا ہوا یہ ہے کہ وعدہ محفوظیت تو سیاق تبلیغ میں کیا گیا ہے، اس لئے اس کا تعلق بھی
قدرة بس اتنی ہی محفوظیت سے ہے، جو آپ کے فرائض تبلیغ میں مانع نہ ہو۔ بالکل محفوظیت

نہ مقصود تھی، نہ ہو سکتی تھی۔ مرض، زخم، صدمہ و غم وغیرہ تو حکمت تکوینی کے ماتحت نفع درجہ اولیٰ اور بلندی مراتب کے لئے ضروری ہیں۔ یقیناً اللہ اس کاموقع نہ دے گا کہ آپ کے دشمن آپ تک پہنچ کر تبلیغ دین میں کوئی رکاوٹ پیدا کر سکیں اور فقہانے آیت سے استنباط کیا ہے کہ رسول ہی کی طرح نابالغان رسول، یا حکمائے امت کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ شریعتیہ میں اختلاف و کتمان سے کام لیں۔

—: (۵۱) :—

آج کی صحبت میں، اور کچھ ہی دیر پہلے آپ سُن چکے ہیں کہ جن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مسیح ہی تو خدا ہیں، قرآن اُن کی تکفیر قطعی ظاہر کر چکا، اور انھیں دائرہ شفاعت و سفارش سے باہر رکھ چکا ہے۔ اب ایک دوسرے عقیدہ کو بھی سُن چیلے، جو پہلے عقیدہ کی طرح ایک محدود فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ دنیا کے مسیحیت میں خوب رچا بسا ہوا، اور قرآنی نصرت سے الگ، اور کہیں پست و فروتر ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۖ (آیت ۷۹)

یقیناً وہ (لوگ بھی) کافر ہو گئے، جنہوں نے کہا خدا تین میں سے ایک ہے۔

یہ کھلا ہوا اشارہ عقیدہ تثلیث کی جانسی ہے، یعنی اس عقیدہ کی طرف کہ باپ، بیٹا و روح القدس یہ تینوں اقنوم (اصل) خدا ہیں، منفرد ابھی اور مجموعاً بھی، الگ الگ خدا ہیں اور تینوں ہی کر بھی خدا۔

اور اس وقت دنیا کے مسیحیت کا عام عقیدہ یہی ہے۔ قرآن نے اس عقیدہ پر صاف کفر کا اطلاق کیا ہے، اور اس کے ماننے والوں کو کافر کے لقب سے یاد کیا ہے، اور نصاریٰ و اہل کتاب سے انھیں الگ کر دیا۔ یہ بس بڑے کھرے کافر ہیں، ایمان کے دائرہ سے خارج، اور مٹا حقیقت حال بھی بیان کر دی۔

وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا إِلَهُ وَاحِدٌ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ

لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (آیت ۷۷)

اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی معبود نہیں، بجز خدا کے واحد کے، اور یہ لوگ اگر اپنے ان اقوال سے باز نہ آئے تو ان میں جو لوگ کافر رہیں گے ان پر عذاب دردناک واقع ہو کر رہے گا۔

کوئی خدا بجز ایک کے نہیں، نہ عدد و شمار کے لحاظ سے، نہ کسی اور اعتبار سے۔ مِنْ إِلَهٍ میں مِنْ زائد، کلیت یا استغراق کے لئے ہے۔

عذاب واقع ہو کر رہے گا، آخرت میں تو بالیقین، اور دنیا میں بھی حسب مصلحت کوئی وعید ان کے حق میں ہے جن پر اس عقیدہ کی گمراہی پوری طرح واضح ہو کر رہی، اور پھر بھی اسی پر قائم ہے مِنْهُمْ میں مِنْ تبعضیہ ہے۔ اس نے یہ صاف کر دیا کہ علم الہی میں یہ بات تھی کہ دنیا میں بہت سے لوگ اپنے اس کفرانہ عقیدہ سے باز آجائیں گے اور ایمان صحیح لے آئیں گے۔ وہ لوگ اس وعید سے خارج ہیں۔ حقیقت مثبت کا بیان ایک ہی آیت بعد پھر ہے:

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ؕ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

فَأَمَّا صِدْقُهُ ؕ كَانَا يَأْكُلَنِ الطَّعَامَ ؕ أَنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ

لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ أَنْظُرْ أَفَى يُؤْفَكُونَ ؕ (آیت ۷۹)

یسح ابن مریم کچھ بھی نہیں، بجز ایک رسول کے، جن سے قبل اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔ اور ان کی ماں ولیدہ تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھئے کہ ہم کس طرح صاف دلائل ان کے سامنے بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھئے وہ کس طرح اُلٹے چلے جاتے ہیں۔

یعنی محض رسول خدا۔ ایک طرف نہ خدا، نہ فرزند خدا، نہ منظر خدا، نہ شیل خدا اور دوسری

طرت نہ ساحر، نہ شعبہ باز۔ صحیح مرتبہ نہیں ایک رسول کا، جیسے کہ پہلے بھی رسول آچکے ہیں۔
ابن موسیٰ، لا کر یہ یاد دلا یا کہ ایک عورت کے بطن سے تھے، اور اس لئے بجز بشر کے
اور کیا ہو سکتے تھے۔ اور ماں صدیقہ تھیں، یعنی ولیہ تھیں، نہ مادر خدا، اور نہ معاذ اللہ کوئی مشتبہ چال چلن،
والی۔ اور دونوں کَنَا یا صُكَلانِ الطَّحَام۔ اپنے سارے تقویٰ کے باوجود، اس
مادی اور بشری جسم کے ساتھ، ساری مادی و جسمانی ضرورتوں کے محتاج۔ اتنی صاف، سیدھی
صریح حقیقت سن کر بھی ان ثلثیت پرستوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کے خرافات میں پڑے
ہوئے ہیں۔

”اقانیم میں تینوں خدا کی وحدت ایک ہے۔ تین خدا نہیں۔“
ترکیب کے وحدت پیدا ہوتی ہے اور وحدت کا نام ہی ترکیب ہے۔“
”اقنوم وجود باپ ہے، اقنوم جان بیٹا، اور اقنوم علم روح القدس“
یہ صرف نمونے کے طور پر چند سچی اسرار دینیات نقل کر دیے گئے۔
اب آج کی صحبت کے اختتام پر وہ آیت ملاحظہ کیجئے جس میں سچی شرک کی جڑ بنیاد کی
پوری نشان دہی کر دی ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْا
اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّضَلُّوْا
عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ ۝ (آیت ۸۲)

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو، اور ان لوگوں کے
خیالات پرست چلو، جو پہلے (خود بھی) گمراہ ہو چکے ہیں، اور بہتوں کو گمراہ کر چکے
ہیں اور راہِ راست سے بھٹک چکے ہیں۔

اس میں صاف اشارہ اس کا آگیا کہ مسیحیت کی گمراہیاں و بعقیدہ گمراہیاں کسی دوسری گمراہ و کجرو
اور زمانہ سچ سے قبل کی قوم کی ریس اور تقلید نے پیدا کی ہیں۔ اور اھواء کہتے ہیں لغو و بے بنیاد

خیالات میں گڑھت عقائد اور خیالی ڈھکوسلوں کو۔ جو لوگ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ سے نہت ہیں، اور خود عالم و فاضل فرنگیوں کی مرتب کی ہوئی (Biblical Criticism) پر نظر رکھتے ہیں، وہ ان باتوں کی باتوں پر عیش عیش کر اٹھیں گے۔

چھٹی صدی عیسوی کا ایک عرب امی، آخر ان تاریخی حقائق سے باخبر ہو ہی کیسے سکتا تھا! تا وقتیکہ عالم الغیب اسے براہ راست تسلیم نہیں دے رہا تھا۔

قدیم مصری شرک جو یونانیوں میں پوری طرح حلول کر آیا تھا، اور بڑے بڑے یونانی فلسفی، اسکندریہ کے مرکز عقلیت۔ روشن خیالی سے مرعوب و متاثر تھے، حضرت عیسیٰ کی تعلیم جب شروع شروع پھیلی تو اس پر یہود کے اکابر

انھیں یونانیوں کے آگے گردن ڈال چکے اور ان سے علول (LOGOS) وغیرہ کے عقیدے اخذ کر چکے تھے

مسیحیوں نے ان مشرکانہ خرافات کو بلا تامل قبول کر لیا، اور پھر پوپس (سنٹ پال) نے حضرت مسیح کے تعلیمات کو تمام تر مسیح کے مسیحیت کو یونانی شرک کی ایک شاخ ہی بنا دیا۔

آخر میں رہی سہی کسر رومیوں کے مشرکانہ عقائد و خرافات نے پوری کر دی۔ موجودہ مسیحی قوموں کے عقائد و رسوم کثرت سے مصری شرک، یونانی شرک اور رومی شرک کی صدائے بازگشت ہیں، اور بس!



پانچواں خطبہ

— (۵۲) —

مسیحیت، تثلیث اور مسیح پرستی کا رد سورہ آل عمران میں اچھا خاصہ ہو چکا ہے لیکن سورہ المائدہ میں بھی کچھ کم نہیں۔

دو چار آیتیں اس موضوع سے متعلق پچھلے خطبہ میں گزر چکیں۔ اب سورہ کے ختم کے قریب اسی موضوع کی مناسبت سے پہلے کچھ فقرے تذکیر و عظمت کے آئے ہیں، وہ بھی ملاحظہ ہوں۔ ابتدا میں ایک عام تذکرہ حشر میں پیبروں سے سوال و جواب کا ہے، جو ایک مؤثر مرقع کشی کا کام دیتا ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا بِأَنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ (آیت ۱۰۹)

(اس دن سے دُرُ) جس دن اللہ پیبروں کو اکٹھا کرے گا، پھر ان سے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ ہم کو کچھ علم نہیں چھپی ہوئی باتوں کو خوب جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔

انبیاء کے جواب کا ماحصل یہ ہے کہ ہمیں علم نہیں کہ ہمارے پیچھے ان لوگوں نے کیا کیا کہا! یا یہ کہ ان کے واقعی عقیدے کیا تھے۔ ہم تو ان کے صرف ظاہری اعمال و اقوال کو جانتے ہیں۔ باطن کا

علم تو تجھی کو ہو سکتا ہے۔ اور جزا تو صرف اصل عقائد ہی پر ملے گی۔ اور یہی جواب غلبہ خشیت سے ادباً و احتراماً بھی ادا ہو گا۔ گویا وہ کہیں گے کہ تیرے علم کامل و محیط کے آگے ہمارا علم پیچ ہے۔ و کچھ ہمیں علم ہے بھی اُس کا ہم سے عالم تر تو تو ہی ہے، اور اس پر سزا دینا یہ کہ ہمیں جو کچھ علم حاصل ہے وہ محض درجہِ ظن کی چیز ہے۔ اور آج دن کشفِ حقائق کا ہے جب محض ظن کام نہیں لے سکتا۔ آج علم ہی کام دے گا، اور وہ تجھی کو حاصل ہے۔

اس عمومی تمہید کے بعد ذکرِ خصوصی حضرت عیسیٰ کا شروع ہوتا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى
وَالِدَتِكَ اِذْ اَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ فَتُكَلِّمُ النَّاسَ فِي
الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰتَۃَ
وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ
فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ
وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ
اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَا
اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (آیت ۱۰۷)

(اور وہ وقت یاد میں رکھو) جب اللہ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ میرا انعام اپنے اور اپنی والدہ کے اوپر یاد کرو، جب کہ میں نے تمہاری تائید روح القدس کے واسطے سے کی تھی۔ تم آدمیوں سے کلام گو میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی۔ اور جب کہ میں نے تمہیں عیسوی کتاب و حکمت کی اور توریت و انجیل کی، اور جب تم پر بندہ جیسی ایک شکل وجود میں لانے سے پہلے تم سے، اور پھر تم اس کے اندر پھونکا کرتے تھے تو وہ پرندہ بن جاتا تھا۔ میرے حکم سے، اور تم مادرِ زاد اندھے اور کور بھی کو چھپا کر دیتے تھے میرے حکم سے، اور جب تم مردوں کو نکال کھڑا کرتے تھے میرے حکم سے،

اور جب کہ میں نے روک رکھا تھا۔ بنی اسرائیل کو تم سے، جب تم ان کے پاس روٹیں
نشانیاں لے کر آئے تھے۔ پھر ان میں سے جو کفر اختیار کئے رہے وہ بولے کہ یہ تو کچھ
نہیں، بس ایک کھلا ہوا جادہ ہے۔

اَذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ نے صاف کر دیا ہے کہ انعامات کا سرچشمہ
تو وہی ایک ذات تبارک و تعالیٰ ہے۔ مسیح اس کے صرف ایک نعمت یافتہ و مقرب بند
اور والدہ مسیح اس کی صرف ایک نعمت یافتہ اور عزیز بند ہی ہیں۔
لفظ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ میں یاد دلایا ہے کہ وہ ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوئے
نہ کہ ابن البشر۔

عَلَىٰ وَالِدَتِكَ کے طریق مخاطب سے مرشد تھانویؒ نے استنباط یہ کیا ہے کہ اہل اللہ
کی اولاد میں ہونا بھی ایک نعمت و شرف ہے۔ رہی آپؐ کی تعلیم کتاب و حکمت تو سارے ہی
پیغمبر اس لحاظ سے شاگرد حق تعالیٰ ہوتے ہیں اور سب کے بڑھ کر ہمارے حضرت خاتم النبیینؐ۔
اور الکتاب سے سیاق میں مراد جنس کتاب ہے۔

اب رہے وہ خوارق و عجائب جو آیت کے اس ٹکڑے میں گنائے گئے ہیں، ان
سب کی تشریح ایک پچھلے خطبہ میں سورہ آل عمران کی آیتوں کے حوالہ سے اور ان کے ذیل
میں عرض کی جا چکی ہے

يَا ذِي النُّفُورِ کی تکرار بڑی ہی اہم اور قابل غور ہے۔ خوارق و عجائب جو کچھ بھی ہوئے
بادی النظر میں وہ کیسے ہی عجیب و غریب ہوں۔ بہر حال تھا وہ سب کچھ کسی نہ کسی قانون الٰہی
ہی کے ماتحت، قانون تکوینی ہی کی کسی نہ کسی دفعہ کے ماتحت۔ ہر اے جو بہ میں خالق کائنات
ہی کا کوئی نہ کوئی قانون کار فرما تھا۔ معجزہ کی حقیقت جیسا کہ پہلے ہی عرض ہو چکا ہے، بس
اتنی ہی ہے کہ وہ خارق عادت ہو جس کا ظہور ہمیر کے ہاتھ پر، منکروں اور کافروں پر ہمیر کی
تائید غیبی اور نصرت الٰہی کے اظہار کے لئے کرایا جائے۔ اور خارق حادث وہ واقعہ یا فعل ہے

جو کائنات مادی میں بندوں کے سمجھے اور قرار دیے ہوئے کسی آئین و قاعدہ سے الگ ہو۔
 مگر فطرت کا عام قانون و قاعدہ تو بندوں ہی کے مشاہدات و تجربات سے اخذ کیا جاتا ہے
 مثلاً ہمارے ملک میں جون کے مہینہ میں تیز گرمی اور دسمبر کے مہینہ میں تیز سردی عموماً و عادی
 ہوتی ہے۔ اب کسی پیمبر کی دعا سے جون میں برف پڑنے لگے اور دسمبر میں گرجنے لگے
 تو یہ اس پیمبر کا معجزہ ہوا۔ مادیات یا شیخ پرستوں کی پہلی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے بندوں
 کے تجربہ و مشاہدہ کو خود خالق کی طرف سے کسی مستقل قانون یا قاعدہ کا اعلان سمجھ لیا۔ اور
 دوسری غلطی یہ کہ وہ قاعدہ و قانون کو قانون ساز اور قاعدہ گر کی مرضی و ارادہ سے بے نیاز
 مستقل و مستمر لایزال حقیقتیں قرار دے بیٹھے۔

تَخْلُقُ یہاں جس سیاق میں آیا ہے، اس کے لحاظ سے تَخْلُقُ کے معنی صورت
 بنانے کے ہیں۔ نسبت سے بہت کرنے کے نہیں۔ اور صاحب کثافت نے اسے بھی
 صاف کر دیا کہ فَتَنَ فِيهَا میں ضمیر ہا هَيْئَةً کی طرف نہیں کھینچنے کے
 کاف کی جانب ہے۔

اخیر آیت میں یہ جو آیا ہے کہ منکر اور باغی اسرائیلیوں کا حضرت مسیح پر دست از
 تکبیس نہ چل سکا، تو یہ اشارہ اس تاریخی حقیقت کی طرف ہے کہ یہود نے آپ پر غلبہ حاصل
 کرنے کی بار بار کوشش کی اور بار بار ناکام رہے۔ چنانچہ انجیل یوحنا میں ہے کہ:
 ”انہوں نے یسوع کو مارنے کا بیڑا اٹھایا تھا، مگر یسوع چھپ کر ہیکل سے

نکل گیا۔“ (باب ۸، آیت ۵۹)

اور دوسری جگہ اسی انجیل میں ہے:

”انہوں نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔“

(باب ۱۰، آیت ۳۹)

البیِّنَات کے تحت میں دلائل عقلی اور خوارق و معجزات سب آگئے۔

— (۵۳) —

اسی سورۃ المائدہ کے بالکل ختم پر ایک اور بڑا مؤثر مکالمہ حشر کے دن کا مذکور ہے اور اس میں مسیحیت اور مسیح پرستی کا ایک نئے عنوان و اسلوب سے ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰى ابْنُ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ
اَتَّخِذُوْنِیْ وَاٰمِیَ الْهٰلِکِیْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آیت ۱۱۶)

(ذہن میں لے آؤ وہ وقت) جب اللہ سوال کرے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم یہ تو بتاؤ کہ کیا تم لوگوں سے یہ کہہ آئے تھے کہ اللہ کے علاوہ مجھے اور میری ماں کو

معبود بنا لینا۔

آیت میں تو لفظ قَالَ ہے اور ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ یہ صیغہ ماضی کا ہے لیکن یہ بھی قرآنیات کا ہر ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ قرآن میں ذکر جب کسی مستقبل واقعے سے متعلق آتا ہے تو اظہار اس سے قطعیت کا کرنا منظور ہوتا ہے یعنی جس چیز کا آئندہ ہونا قطعی اور یقینی ہوتا ہے، اس کو قرآن یوں بیان کرتا ہے جیسے وہ واقع ہو چکی۔ تو قرآن یہاں بھی اپنے اسی عام اسلوب بیان کے مطابق کہتا ہے کہ ذرا اس منظر کو اپنے سامنے لے آؤ کہ جب حق تعالیٰ سوال کرے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم یہ تعلیم دے آئے تھے کہ خود تم کو اور تمہاری والدہ کو بھی اللہ کے علاوہ معبود ٹھہرا لیا جائے ؟

مسیح پرستی تو خیر موجودہ رائج الوقت مسیحیت کے مرادف سے ہی، مریم پرستی بھی دنیا کے مسیحیت کا کوئی مخفی اور نامعلوم واقعہ نہیں (Divine Virgin) ”خدائی باکرہ“ ان کا گھلا ہوا لقب ہے، ندریں اور اُنہیں ان کی مانی جاتی ہیں، نیازیں ان کے نام پر ہوتی ہیں، دعائیں انہیں مخاطب کر کے کی جاتی ہیں، کیتھولک گرجوں میں قد آدم تصویر ان کی لگی رہتی ہے، اودھان کے آگے رسوم پرستش بجالائے جاتے ہیں، کتابی حوالوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں اس خاکسار کی

انگریزی تفسیر۔

آخرت میں جو سوال حضرت مسیح سے ہوگا، ظاہر ہے کہ اس سے محض استفہام مراد نہیں، بلکہ مریم پرستوں پر مزید جھٹ قائم کرنا، اور انھیں شرمندہ و خجل کرنا اور انھیں آپ اپنی نظر میں ذلیل کرنا ہے۔ مخاطب میں لفظ مسیح نہیں بلکہ محض اصلی نام عیسیٰ ہے ابن مریم کے اضافہ کے ساتھ، اور اس حقیقت کے یاد دلانے کو کہ وہ انسان ہی نہیں انسان زادے بھی ہیں!

یہ تو ہوا سوال۔ اب وہ جواب کے پہلے ہی فقرے میں عرض کرتے ہیں:

قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقِّ

عرض کریں گے کہ پاک ہے تیری ذات۔ یہ تو مجھ سے ممکن نہ تھا کہ میں ایسی

بات کہہ دیتا جس کا مجھے کوئی حق ہی نہ تھا۔

یعنی بارگاہ تیری ذات برتر و بالا ہے۔ ہر شرک کی آلودگی سے اور ہر ایسے انساب کے جو تیرے شایان شان نہ ہو۔ بھلا میری مجال تھی کہ میں ایسا صریح کلمہ باطل زبان سے نکال سکتا۔ اور آگے عرض کریں گے:

إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا

أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ (آیت ۱۱۶)

اور اگر میں نے (کہیں) کہا ہوتا تو ضرور ہی تجھے اس کا علم ہوتا۔ تو جانتا ہے

جو کچھ میرے دل میں ہے، اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے بیشک

تو پوشیدہ چیزوں تک کا خوب جاننے والا ہے۔

بالفرض میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو ضرور ہی تیرے علم میں ہوتی۔ اور جب تیرے علم میں نہیں تو ظاہر ہے کہ واقع ہی نہیں ہوتی۔ تیرے علم کا مل و محیط کو میرے علم ناقص و محدود سے نسبت ہی کیا ہے؟ اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے۔ تجھ پر تو ہر غیب روشن ہے۔ آمین۔
ایم رازمیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ سوال کا جواب براہ راست دینے کے بجائے

اسے علم اکہی پر معمول کر دینا ادب و احترام کے تقاضے کے زیادہ مطابق ہے۔ اور بہ طور تعلیم و تکرار یہ خادم عرض کرتا ہے کہ مسیح کا یہ کلام عبدیت و عبودیت کا بھی شاہد عادل ہے۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ میں تعلیم فلاں اور فلاں دے آیا تھا، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں تو وہی تعلیم دے آیا تھا جس کا تو نے حکم دیا تھا۔ اور یہ پیام بھی میری اپنی طرف سے نہ تھا، بلکہ یہ بھی تیرے ہی ارشاد کی تعمیل تھی۔

قرآن آپ کے جواب کی مزید حکایت یوں بیان کرتا ہے :

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَّا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ أَعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ
میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا تھا سوا اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا،
وہ بھی کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔

یہ تو ہونی قرآن مجید کی حکایت۔ لیکن خود انجیلوں میں اتنی تصحیف و تصرف کے بعد بھی تعلیم لکھی چلی آتی ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے :

”یسوع نے اس سے کہا : اے شیطان دور ہو، کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند
اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔ تب ابلیس اس کے پاس سے
چلا گیا اور فرشتے آکر اس کی عبادت کرنے لگے (باب ۱۰، آیت ۱۱)
اور انجیل لوقا میں ہے :

”یسوع نے جواب میں اس سے کہا کہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر
اور صرف اسی کی عبادت کر۔“ (باب ۴، آیت ۸)

جواب مسیح ابھی ختم نہیں ہوا۔ چل رہا ہے :

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي
كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (آیت ۱۱)
میں اس پر آگاہ رہا، جب تک میں ان کے درمیان رہا۔ پھر جب تو نے مجھے

اٹھایا (جب سے) تو ہی ان پر نگراں ہے۔ اور تو تو گواہ ہر چیز پر ہے۔
 غور کیجئے کلام میں، ایک بار پھر اپنی نجدیت و شریعت کا اور حق تعالیٰ کے علم محیطہ
 کاٹ کا اثبات ہے۔ کہتے ہیں کہ میں جب تک دنیا میں موجود رہا، اپنی اُمت کا عالی سرے
 علم و مشاہدہ میں تھا۔ پھر تو نے مجھے دنیا سے اٹھایا۔ اس کے بعد سے مجھے کیا خبر
 اس کا علم تو بس بھی ہمہ وقتی نگراں کو رہ سکتا ہے۔ اور آگے چلئے:

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ
 أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (آیت ۱۱۸)

تو اگر انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو انہیں بخش دے
 تو بھی تو زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

عرض کرتے ہیں کہ تو مالک و مختار ہے، ہمہ توان و ہمہ توان ہے۔ تو جو چاہے ان کے ساتھ
 معاملہ کر۔ اگر سزا کا معاملہ کرے تو میں تجھ میں اور تیرے بندوں کے درمیان دخل دینے والا
 کون، اور اس کی مجھے کہاں مجال۔ اور اگر تو انہیں معاف ہی کر دینا چاہے تو کون تجھے
 روک سکتا ہے۔ تو سب پر غالب اور تیرا ارادہ سب پر حاکم و مقتدر، اور اسی کے ساتھ تو حکیم مطلق
 بھی۔ تیرا کوئی بھی فیصلہ حکمت و مصلحت تکوینی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ تو کرے گا تو وہی جو
 عین آئین حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا۔

یاد کر لیجئے کہ یہ ساری گفتگو دنیا میں نہیں، قیامت میں ہو رہی ہے، جب کوئی محل ہی شفا کا
 کافروں اور منکروں کے حق میں باقی نہ رہے گا۔ یہیں سے یہ ہے کہ حضرت مسیح کے اس کلام میں
 کوئی شائبہ شفاعت و سفارش کا، باوجود ان کے پیغمبر جلیل افسردہ ہونے کے نہیں۔ بلکہ توفیق یا
 پسردگی تمام تراش کی طرف ہے۔

اور ضمناً اس سے تردید بھی سچوں کے اس عقیدہ کی نکل آتی کہ قیامت میں عدالت کا
 کام خدا کے نہیں، خدا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہوگا۔ انجیل یوحنا میں ہے:

”باپ کسی کی بھی عدالت نہیں کرتا، بلکہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے پر

رکھا ہے۔“ (باب ۱۳، آیت ۱۳)

ان سارے مکالمات و مخاطبات کے بعد قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ
جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ

اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (آیت ۱۱۹)

اشر فرمائے گا آج وہ دن ہے، جب بچوں کے کام ان کا سچ آئے گا،

ان کے لئے باغ ہوں گے جن کے پتے ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ اشران میں وہ

ہمیشہ ہمیشہ کر رہیں گے۔ اشران سے خوش رہا اور وہ اشر سے خوش ہے۔

یہی بڑی کامیابی ہے۔

صَادِقِينَ کا لفظ ابھی آپ نے سنا ہے۔ اس کا مفہوم سمجھ لیجیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو

دنیا میں عقیدہ صحیح اور عمل صالح پر قائم رہے۔ اس کے تحت میں انبیاء کے علاوہ اولیاء اور عام

مومنین بھی داخل ہیں۔ عام مفسرین ادھر گئے ہیں کہ یہ اشارہ پوری آیت کے مضمون یعنی جنت

اور خلود جنت اور رضوان الہی سب کی جانب ہے۔ لیکن امام رازی نے اپنی نکتہ سنجی سے یہ بات

پیدا کی ہے کہ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ کا تعلق صرف نعمت رضوان الہی سے ہے۔ جس کے سامنے

جنت کی ساری نعمتیں بسیج ہیں۔ اور ان نعمتوں کو خلود ہی نہیں ابدیت بھی حاصل ہوگی۔

خَالِدِينَ فِيهَا کے ساتھ أَبَدًا کی بشارت یہاں کی طرح اور بھی بار بار اہل جنت

کے لئے آئی ہے اور اہل جہنم کے لئے أَبَدًا کی صراحت ایک ہی جگہ آئی ہے۔

————— ۵۴ —————

جاہلی قوموں کی ذہنیت بھی، ان کے عقائد کی طرح، ایک خاص قسم کی ہوتی ہے۔ قرآن مجید

کثرت سے مقامات پر ان کے اعتراض نقل کر کے اس کا پردہ بھی فاش کیا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ (انعام، آیت ۸)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) کے اوپر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا۔

کہنے والا مشرکین ہی کا کوئی گروہ تھا۔ رسول کا بشر محض ہونا ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا۔ ان کی سمجھ میں اوتار یا منظر خدا آجاتے تھے۔ یہ دیوتاؤں کے بلا تامل قائل تھے۔ خدا کے بیٹے بیٹیاں یقین کر سکتے تھے۔ یہ سب باسانی ان کے لئے قابل قبول تھا۔ لیکن بشر کی رسالت کو ان کے دماغ کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہ ہو سکے۔ برابر مطالبہ ان کی طرف سے اور بشریت کا خرق عادت کا ہوتا رہتا۔ فرشتہ کا بھی تجل ان کے یہاں نہ تھا۔ البتہ پیغمبر جب کہ فرشتہ میرے پاس پیام الہی لاتا تو اسے فرض کر کے یہ کہنے کو اچھا، اگر ایسا ہے تو فرشتہ کو لاؤ یعنی دکھاؤ۔ حالانکہ قائل جب بھی نہ ہوتے۔ بلکہ سخن پروری کی عادت سے مجبور ہو کر مانگ ہی کیے چلے جاتے۔

آگے جواب میں ارشاد ہوتا ہے :

وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكَ لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝ (آیت ۸)

حالانکہ اگر ہم فرشتہ اُتار دیتے تو قصہ ہی ختم ہوتا، پھر تو ان کو ذرا ہلت نہ ملتی۔ یعنی فرشتہ کا نزول دنیا میں اس طرح کردہ کافروں تک کو نظر آجائے یہ تو دستور الہی میں عین وقوع عذاب کے وقت ہوتا ہے، اس کے بعد ہلت کا امکان ہی کہاں ہے؟ عالم فہم اردو میں یوں سمجھئے کہ ایسے کھلے ہوئے معجزہ کے بعد عالم ناسوت کے حجابات اٹھ جائے ہیں اور غیبت کے پردوں کے بجائے مواہم میدان شہود کا ہو جاتا ہے۔ عالم برزخ اسی کا دوسرا نام ہے، اور وہ عالم کشف حقائق کا محل ہے۔

اور کافروں کی اصل حقیقت معذب ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس طاری شدہ عالم برزخ کے وجود میں آتے ہی اس حقیقت کا ظہور اور سزا و عذاب کا ترتیب لازم ہو جاتا ہے۔

ثُمَّ لَا يَنْظُرُونَ ۝ آیت میں ثُمَّ اس اظہارِ شدت کے لئے ہے یعنی عذاب واقع تو ہو ہی گا، اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمت ذرا بھی نہ ملے گی۔

گویا عذاب کی شدت سے بھی بڑھ کر اس کا فوری وقوع ہے۔ — مزید یہ کہ:
وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبَسُونَ ۝ (آیت ۹)

اور اگر ہم فرشتہ ہی کو تجویز کرنے تو اسے بھی آدمی ہی بنا کر بھیجتے اور ان پر ہم (پھر) وہی اشتباہ ڈالتے جس میں اب پڑے ہوئے ہیں۔

یعنی یہ لوگ اس انسانی صورت والے فرشتہ کے باب میں وہی احتمالات، وہی اشکالات، وہی کج بحثیاں پیدا کرتے، وہی کٹ چھتیاں نکالتے جو آج رسول اللہ سے متعلق نکال رہے ہیں۔

مَلَائِكٌ يَّا فَرِشْتَهٗ وَه فَوْرِي مَسْتِي هِي، جسے انسان نہ اپنے عام و معروف جو اس سے دیکھ سکتا ہے، نہ اس کے ملکات کے لحاظ سے اس کا اتباع کر سکتا ہے۔
لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا: اسے بھی شکل و جسم کے لحاظ سے انسان ہی کی جنس کا بنا کر بھیجتے تو تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ تو سکتے۔

لَلْبَسْنَا عَلَيْهِمْ، یہ اشتباہ کا انتساب حق تعالیٰ کی بابت محض تکوینی حیثیت سے اور بطور سبب الاسباب کے ہے۔ اس معنی میں اللہ سانپ کے زہر کا بھی خالق ہے، بیماری اور ہر دک درد کا بھی خالق ہے۔ بدی کا بھی خالق ہے۔ یہاں تک کہ شیطان کا بھی خالق ہے۔ اور ایمان، اسی کے ساتھ سُن لیجئے، کہ نام ہے قلب کی ایک کیفیت اختیاری کا باقی کسی ایسے معجزہ کا سامنے آ جانا، جس سے انسان بالکل بے اختیار و مجبور ہو جائے، جیسا کہ فرشتہ کو اس کی اہل پر دیکھ لینا، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ایمان اختیاری باقی ہی کہاں رہا۔ ایمان تو معتبر جب ہی تک ہے جب تک ایمان بالنبی ہے جب انکشاف و شہود شروع

ہو گیا تو ایمان کا سوال ہی نہ رہا

—: (۵۵) پینچ: —

یہ سورہ انعام چل رہی ہے اور اس کا بیشتر حصہ مسائل و احکام فقہی سے متعلق ہے تاہم دوسری قوموں کے عقائد و اعمال سے بھی جا بجا تعرض ہے۔ اہل کتاب کے متعلق ذکر ہے۔

الَّذِينَ اتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَ تِلْكَ الْأُمَّةَ
أَبْنَاءَهُمْ (آیت ۲۰)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے وہ ان (صاحب) کو پہچانتے ہیں

ایسا ہی جیسے اپنے اجائے قوم کو پہچانتے ہیں۔

اس میں بناء اشکال لفظ آبناء ہم ہے۔ مفسرین و مترجمین کثرت ادا کر گئے ہیں کہ اس سے مراد ان کے بیٹے اور صلیبی بیٹے ہیں۔ اور پھر اس اشکال کو حل کرنے کی ضمنی طرح طرح کی توجہات و تاویلات کی ہیں۔ حالانکہ آبناء ہم سے مراد اگر اجائے قوم لئے جائیں تو سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور مطلب صاف نیکلتا ہے کہ نبی آخر الزماں کی جو کھلی علامتیں ان کی کتب آسمانی خصوصاً قریت میں دی ہوئی ہیں، ان کے لحاظ سے انھیں آپ کا پہچان لینا اور آپ کی تصدیق کرنا ایسا ہی آسان ہے، جیسے خود اپنی قوم و نسل کے انبیاء انبسیار بنی اسرائیل کی شناخت۔ یہاں ذکر اہل کتاب کا مجموعاً و مشترکاً ہو رہا ہے، نہ کہ ان کے افراد کے لحاظ سے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۰ میں ایسے ہی لفظ آچکے ہیں، اور کسی پچھلے خطبہ میں بھی وہ آیت آپ کی سماعت میں آچکی ہے۔

—: (۵۶) پینچ: —

قرآنی قصوں میں ایک اہم و مشہور قصہ رئیس الموحدین حضرت ابراہیمؑ کے

ایمان توحیدی کا ہے۔ آپ کے والد جن کا نام عربی میں تارح آیا ہے اور انگریزی میں تلفظ تیرہ (Tarah) ہے اور فلسطین کا قدیم مسیحی مورخ یوسیبس (Eusebius) کے ہاں آشریا یا شریٹا ہے۔ قرآن مجید نے ان کا نام آذر بتایا ہے، وہ بت پرست ہی نہ تھے بلکہ جیوش انسائیکلو پیڈیا کی روایت کے مطابق بت ساز یا بت فروش بھی تھے (جلد ۱۲- صفحہ ۱۰۷) اور آپ کا ملک کلدانیا یا بابل (موجودہ عراق) بت پرستی اور ستارہ پرستی کے دہرے شرک میں مبتلا تھا تو انھیں ابراہیمؑ کی سرگزشت قرآن کی زبان سے سنئے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آذَرَ اتَّخَذَ آصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي
آذِلُّكَ وَقَوْمَكَ فِي خَلَلٍ مُّبِينٍ ۝ (آیت ۷۴)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آذر سے کہا کہ تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو۔ میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی رہوٹی گراہی میں مبتلا پاتا ہوں۔

وَكَذَٰلِكَ نَرْجِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكَوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (آیت ۷۵)

اور (اس لئے) ہم نے دکھا دی ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کی حکومت، تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں سے۔

چنانچہ وہ خود موقتہ کامل بھی ہو گئے، اور توحید کامل کے مبلغ بھی۔ یعنی زمین اور آسمان پر حق تعالیٰ کی حکومت قاہرہ کے مشاہدہ سے ان کے دل پر توحید کا نقش جم گیا، اور از یاد معرفت سر نے انھیں مزید ایقان تک پہنچا دیا۔

مَلَكَوت سے مراد ہے وہ حکومت جو مخصوص ہے اللہ ہی کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی ربوبیت اور مالکیت کے طریقے ابراہیمؑ کے دل میں اتار دیے۔ اور مشاہدہ

یا اداعت کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ مادی ہی آنکھوں سے ہو۔ چشم اعتبار یا بصیرت عقلی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اور ملکوت کی انصاف میں جو زمین کے حدود کے ساتھ سمادات یا آسمان بھی شامل کر لئے گئے، اس کی بلاغت اور زیادہ ہو جائے گی۔ جب یہ یاد کر لیا جائے کہ اہل کلدانیہ زمینی ہی شرک (بت پرستی) کے نہیں بلکہ آسمانی شرک (ستارہ پرستی) کے بھی مجرم تھے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَا كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَذَا رَبِّي ۖ
فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ۝ (آیت ۷۶)

اور جب رات ابراہیم پر چھا گئی تو انھوں نے تارہ دیکھا۔ بولے یہ میرا پروردگار ہے۔ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو بولے میں غروب ہو جانے والوں سے دل نہیں لگانا۔

اور نہ ایسوں کی الوہیت و معبودیت کا قائل ہو سکتا ہوں۔

ہرگز نہ سمجھئے کہ یہ سارا مکالمہ جو چل رہا ہے، ایک ہی وقت میں ہوا۔ چاند اور سورج کا مشاہدہ ایک ساتھ ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ یقیناً کل ماجرے کے مختلف اجزاء مختلف اوقات میں ہوئے۔

کَوْكَبًا تو لفظی اعتبار سے کوئی بھی ستارہ ہو سکتا ہے، لیکن لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ وہ کوئی بہت ہی روشن ستارہ ہوگا۔ ماہرین فن کا بیان ہے کہ پرستش رب کے زیادہ ان دو ستاروں کی ہوئی ہے: ایک مشتری (Jupiter) دوسرا زہرہ (Venus) ساتھ ہی ہمارے مفسرین قدیم کی صفائے قلب دیکھئے کہ ان کے قلم سے نام ان ہی دو ستاروں کے نکلے ہیں۔

خیر تو آپ نے کوئی روشن ستارہ دیکھا اور اپنی قوم پر حجت الزامی قائم کرنے کو انھیں دکھا کر کہا کہ یہی ہے ہمارا پروردگار یعنی تمھارے زعم و پندار میں۔ یہ طریق مخاطبت اُردو،

فارسی، عربی، انگریزی ہر زبان میں عام ہے کہ مناظرہ کے وقت مخالفت کے قول کو اپنی زبان سے دہرا دیتے ہیں اور لب لہجے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب کا قول اور خیال نقل ہو رہا ہے بغیر اس کے کہ مشکل اس کی تصریح کرے۔ خود قرآن ہی میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ فرمائے گا اَیْنَ شُرَکَآئِیْ؟ اب کہاں ہیں میرے شریک؟ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ تمہارے عقیدے کے مطابق میرے شریک۔ اور یہ مطلب کوئی احمق سے احمق بھی نہ لے گا کہ حق تعالیٰ اپنے شریکوں کا وجود تسلیم کر کے واقعی انھیں بلا رہا ہے۔

لَا اُحِبُّ الْاٰفِلٰیۡنَ سے آپ، نفی اُن کی مطلق معبودیت کی نہیں بلکہ محبوبیت کی بھی کر رہے ہیں۔ آپ فرما رہے ہیں کہ جو ہستیاں خود ہی غیر ثابت اور تغیر پذیر ہوں ان کے لئے جگہ میرے دل میں کسی عزت و وقعت کی کیسے ہو سکتی ہے؟ عدم محبوبیت سیاق عبارت میں صاف عدم معبودیت کے مراد ہے

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ
لَیۡنٌ لِّمۡ یَّهۡدِیۡ رَبِّیۡ لَا کُوۡنَنَّ مِنَ الْقَوۡمِ الضَّالِّیۡنَ (آیت)
پھر جب آپ نے دیکھا چاند کو چسکتے ہوئے تو بولے یہ میرا پروردگار ہے
لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولے کہ اگر مجھے میرا پروردگار نہ ہدایت کرنا
رہے تو میں بھی گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں ۱

لیکن اس کی ہدایت تو اول روز سے میرے شامل حال ہے، اور اس لئے میں تو حید پر قائم ہوں۔۔۔ انبیاء کا یہ کمال عبودیت ہے کہ اپنے ہمنوا کمال کو اپنی جانب منسوب نہیں کرتے بلکہ اسے تمام تر عطیہ الہی سمجھتے اور کہتے ہیں! اور ستارہ پرستی کی طرح فخر پرستی تو جاہلی قوموں میں عام رہی ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیۡ هٰذَا اَکْبَرُ فَلَمَّا
اَفَلَتْ قَالَ یٰۤاٰقُوۡمِ اِنِّیۡ بَرِّۡءٌ مِّمَّا تَشْرَکُوۡنَ (آیت ۷۸)

پھر جب آپ نے سورج کو چمکنے ہوئے دیکھا تو بولے یہی میرا پروردگار ہے، یہ سب بڑا ہے، لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولے اے میری قوم والو! میں اس شرکے بڑی (بیزار) ہوں جو تم کرتے ہو۔

مِمَّا تَشْرِكُونَ میں یہ نہیں فرمایا، کہ جن شرک میں میں اب تک مبتلا تھا اس سے نکل آیا، بلکہ یہ فرمایا کہ وہ شرک جس میں قوم والے مبتلا ہیں۔
هَذَا أَكْبَرُ، آفتاب تو اجرام سماوی میں سب سے زیادہ بڑا ہے، اور اہل کلدانیہ اس میں پیش پیش رہے ہیں۔

هَذَا دِجِیٰ آپ کی گفتگو میں یہ لفظ تین بار آیا ہے، اور وہ تینوں موقعوں پر آپ نے اپنے ہم قوم مشرکوں کی ترجمانی لفظ دِجِیٰ ہی سے کی ہے، کہیں اللہ وغیرہ نہیں لائے ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ مشرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفتِ بوہیت ہی میں لگی ہے، اور یہی آج تک چلا آرہا ہے۔ پیورج دیوتا، چندرمان اور زہرہ و مشتری کو خالق کوئی بھی نہیں کہتا۔ مشرک انہیں مخلوق مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ اے کارسانہ ہیں، ہماری مرادیں ان ہی سے وابستہ ہیں، ہماری دعائیں یہی سنتے ہیں، ہماری آرزوئیں یہی پوری کرتے ہیں۔ دِجِیٰ کا لفظ ایسے موقع پر معنویت سے لبریز ہے۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلدِّينِ فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (آیت ۷۹)

میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اسی کی طرف کر لیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

وَحَاجَّتْهُ قَوْمُهُ ۖ قَالَ اتَّخَذْتَنِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ (آیت)
اور ان کی قوم لگی ان سے جھگڑنے، بولے کیا تم جھگڑا مجھ سے اللہ کے بارے میں کرتے ہو، دراصل ایک وہ مجھے ہدایت دے چکا ہے۔

ہمارے رسول اور رسولِ اعظم کی آمد کے تذکرے پُرانے صحیفوں اور آسمانی نوشتوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب کو مخاطب کر کے ان کی نشان دہی بھی بار بار کر کے ان پر حجت قائم کی ہے۔ سورہ اعراف میں بھی یہ تذکرے ہیں۔ اور ایک جگہ تو بڑی وضاحت و تفصیل سے ارشاد ہوا ہے:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْنُوزًا
عِنْدَهُمْ فِي الْوَرْدَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ
عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَاَلَّذِينَ
آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوا وَنَصَرُوا وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ
مَعَهُ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (آیت ۱۵۷)

جو لوگ پیروی کرتے ہیں اس رسول و نبی کی جس نے ان لوگوں نے کھا ہوا پایا اوریت
اور انجیل میں، وہ انھیں نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں بُرے کاموں سے
روکتا ہے، اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں بتاتا ہے، اور ان پر گندی چیزیں حرام
رکھتا ہے، اور ان پر سے بوجھ اور قیدیں جو ان پر اب تک تھیں، اُتارے دیتا ہے۔
سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور ان کی مدد کی اور اس نور
کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اُتارا گیا۔ سو یہی لوگ تو ہیں پوری خلاص پانے والے
يَجِدُونَهُ مَكْنُوزًا : جسے کھا ہوا پاتے ہیں، کے کھلے ہوئے معنی ہیں جن کی
صفات و علامات وہ لکھی ہیں پاتے ہیں اپنے صحیفوں میں۔

الَّذِينَ سے مراد عام انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں مراد خصوصی ہے اہل کتاب
سے۔ اور رسول اُمّی سے مراد بے پڑھا بھی ہو سکتا ہے (جیسا کہ آپ واقعہ تھے) اور
اُمّ القریٰ والا بھی، اور اُمت رکھنے والا بھی۔

اور اصل ان سب باتوں کا ایک ہی ہے یعنی شخصیت محمدی۔ تو آپ کی بابت غلامتیں
توریت و انجیل سے، تحریف و تصحیف کے بعد بھی مدخل سکیں۔ توریت کے دو ایک حوالے آپ
بھی سن لیں۔ صحیفہ استنارہ باب ۱۸ کی پندرھویں آیت ہے:-

”خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا“

تم اس کی طرف کان دھریو۔“

”تیسری مانند“ کا اطلاق اگر ہمارے رسول پر بھی نہ ہو گا تو اور کس پر ہو گا؟ اور پھر تیرے بھائیوں میں سے بنی اسمعیل اگر بنی اسرائیل کے بھائی نہ تھے تو اور کون تھے؟ دوسری آیت بھی اسی صحیفہ استثنائے ار کے اٹھارویں باب کی اٹھارویں آیت ہے ”اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا، میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام ان کے منہ میں ڈالوں گا۔“

پھر وہی بھائیوں کا ذکر، اور اسرائیل کے بھائیوں، اسماعیلیوں میں سے، اور وہ بھی وحی لفظی کا دعویٰ لے کر اور کوئی دوسرا نبی آیا ہے؟

تیسری جگہ پھر اسی صحیفہ کے باب ۲۳ کی دوسری آیت ہے:

”خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران کے میدان میں

وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اور اس کے واسطے ایک

آتشیں شریعت ان کے لئے تھی۔“

سینا سے اشارہ حضرت موسیٰ کی، اور سعیر سے اشارہ حضرت عیسیٰ کی جانب ہونا جس طرح ظاہر ہے، اسی طرح مکہ کی پہاڑی فاران سے اشارہ حضرت محمدؐ کی جانب ہونا بالکل ظاہر ہے۔ آتشیں شریعت اسی رسول کی تھی۔ دس ہزار پاک نفس صحابہ کے ساتھ فتح مکہ کے وقت شہر میں داخلہ بھی ہمارے ہی رسول کا ہوا تھا۔

چوتھا حوالہ صحیفہ پیدائش کے باب، ۱ کی اکیسویں آیت کا ہے:

”اور اسمعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا، اور

اسے برومند کروں گا، اور اسے بہت بڑھاؤں گا، اور اس سے بارہ سردار

پیدا ہوں گے، اور میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔“

حضرت اسماعیل کی نسل کے حق میں یہ سارے وعدے ہمارے رسول ہی کی ذات میں پورے ہوئے ہیں۔

صحیفہ پیدائش کا ایک اور حوالہ اس کے باب ۴۹ کی دسویں آیت کا: ”یہوداہ سے ریاست کا عہد جُدا نہ ہوگا، اور نہ حاکم اس کے پاؤں کے دریا سے جاتا رہے گا جب تک کہ سیلا اس کے پاس نہ آجائے اور قومیں اس کے پاس اکٹھی ہوں گی۔“

دنیا کی مختلف قومیں ہمارے رسول ہی کے علم کے نیچے جمع ہوں گی اور سیلا کے معنی ہیں بھیجا جانے والا ہے۔ نیچے جانے والے وہی نبی تھے اور انھیں کے بعد سے یہود کا اقتدار منسایاں ظہور پر ختم ہوا۔

اسی طرح حضرت داؤد کے ایک تفسیر میں ہے:

”میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلایاؤں گا۔ بس سارے لوگ ابدالا باد

تیری ستائش کریں گے۔“ (زبور۔ ۴۵۔ ۱۷)

ایک اور حوالہ بھی اسی عہد عتیق کے صحیفہ یسعیاہ کا ہے:

”دیکھ میرا بندہ جسے میں سنبھالنا میرا برگزیدہ جس سے میرا جی دلانی ہے،

میں نے رنج اس پر رکھی۔ وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا۔ وہ

عدالت جاری کرائے گا کہ دائم رہے اور اس کا زوال نہ ہوگا، اور نہ وہ جائے گا

جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا، اور بحری مالک اس کی راہ میں (ایسا، آیت ۱۰)

”میرا بندہ“ اس عبارت میں صاف عہد کا ”دسولہ“ ہے، اور ”میرا برگزیدہ“

صاف ”مصطفیٰ“ ہے، اور جس کا ”زوال نہ ہوگا“ وہی تو ”خاتم النبیین“ ہے اور انھیں

کی شریعت بحری مالک تک پھیل گئی

یہ سارے بیانات عہد عتیق کے تھے۔ اب انجیل کی بھی سنئے:

مسیحی کے باب ۲۱ کی آیات ۲۳ تا ۲۴ یہ ہیں۔

”یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کوئے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مگر جس پر وہ گرے گا اسے وہ پیس ڈالے گا۔“

جس پتھر کو اسرائیلیوں نے ہمیشہ رد کیا تھا، وہ ایسٹیلی تھے۔ اور آخر میں اسی ایسٹیلی نسل کے فرد کو نبوت ملی اور نبوت بھی اس شان کی کہ یہود و نصاریٰ جو بھی اس سے ٹکرائے چڑچڑ ہو کر رہ گئے۔

انجیل یوحنا میں حضرت مسیح کا بیان ہے کہ:

”رہا وہ کہ جس کا میرے باپ نے وعدہ کیا ہے، اس کو تم پر نازل کروں گا۔ لیکن جب تک عالم بالا پر سے تم کو قوت کا لباس نہ ملے، اس شہر میں ٹھہرے ہو (باب ۲۳ آیت ۳۹)۔ جب تک ہمارے رسول کا نزول اجلال نہ ہو، تقدس شہر یرושلم ہی کا قائم رہا۔ اور اس کے بعد کعبہ (واقع شہر مکہ) کی طرف منتقل ہوا۔“

اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب حضرت یحییٰ کے ظہور کے بعد یرושلم سے کاہن اور آئے ان کے پاس یہ پوچھنے کے لئے کہ تو کون ہے تو سوال و جواب کے بعد ان لوگوں نے کہا کہ:

”اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر بتیسرہ کیوں دیتا ہے۔“ (باب اول آیت ۲۲)

اس سے صاف صاف ظاہر ہے کہ یہود مسیح کے علاوہ کسی اور نبی کے بھی متظر تھے جسے وہ اپنی زبان میں ”وہ نبی“ کہتے تھے، یعنی قرآن کی زبان میں ”النبی“۔

اور اسی انجیل یوحنا کے باب ۱ کی چالیسویں آیت ہے کہ :

”پس پھر میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا کہ بے شک یہی وہ نیا ہے۔ اور وہ نے کہا یہ مسیح ہے۔“

یہ مزید ثبوت اس کا ہے کہ علاوہ مسیح کے ایک اور بنی ہو خود (البنی) کے آنے کا برابر انتظار ہو رہا تھا۔

اور اسی انجیل یوحنا کے باب ۱ کی سولہویں آیت میں خود حضرت مسیح کی زبان سے نقل ہوا ہے :-

”میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ دوسرا مددگار (یا شفیع یاکیل) بھیجے گا

کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔“

تو یہ ابد تک رہنے والا بجز خاتم النبیین کے اور کون ہو سکتا ہے ؟

انجیل یوحنا کے حوالے ابھی ختم نہیں ہوئے۔ اس کے باب ۱۵ کی چھبیسویں آیت میں حضرت مسیح کی زبان سے ہے :

”جب وہ مددگار (یا شفیع یاکیل) آجائے گا، جس کو میں تمہارے پاس باپ کی

طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح، جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری

گواہی دے گا۔“

اور یہ ابد تک ساتھ رہنے والا اور حضرت مسیح کی تصدیق کرنے والا بجز ہمارے رسول اکرم کے اور کون ہو سکتا ہے ؟

اور یہ سارے انجیلی حوالے جو عرض ہوئے سب انھیں انجیلوں کے ہیں جو مسیحی کلیسا کو مسلم اور ان کے ہاں مستند ہیں۔ باقی مسیح کے حواری برنابا کی انجیل، جس کا ترجمہ عربی اور انگریزی دونوں میں اسی بیسویں صدی میں ہوا ہے، اسی میں کہیں زیادہ اور اشارہ کنایہ میں نہیں بلکہ صریح و واضح الفاظ میں ہمارے نبی کی آمد کی شہادت دے رہی ہے۔

اب قرآن کی آیت میں بوجہ اُتار دینے کی جو بات ہے تو وہ دوسرے لفظوں میں یہی ہے کہ اس رسول کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ اور ان پر حاکم ہوگی۔ اور وہ پیغمبر انہیں نیکی کا حکم دے گا، اور بدی و خجاست کی ہر راہ روکے گا۔ اس کی شریعت جامع و کامل ہوگی۔ وہ سیاسیات، اجتماعیات، معاشرت و معیشت، اخلاق و تمدن سے ہر گندگی کو دور کرے گی۔ وہ عبادات و معاملات میں انفرادی و اجتماعی، اوقاف و روحانی ہر طرح پاکیزگی اور ستھرائی کی راہیں کھولے گی۔ اور ہر شعبہ حیات کو نورانیت و لطافت سے بھر دے گی۔

—: (۵۸) پچھ: —

اسی سورہ انعام میں پیغمبروں اور خصوصاً سلسلہ موسوی کی بعض تفصیلات بیان کرنے کے بعد ذکر کسی خاص شخصیت کا آیا ہے، جس نے دینی نعمتوں سے مالا مال ہونے کے بعد بھی، راہ شقاوت و بدبختی اختیار کر لی۔

وَإِثْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا

فَاتَّبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝ (آیت ۱۷۵)

اور ان لوگوں کو اُس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے کہ اس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا، سو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، اور وہ گمراہوں میں ہو گیا۔

یہ شخص کون تھا، کہاں کا تھا، کس قوم اور زمانہ کا تھا، یہ کچھ متعین نہیں۔ اور جب قرآن اس باب میں ساکت ہے، تو کسی شخص کی تعین پر جزم و اصرار بھی صحیح نہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اشارہ رسول اشوری کے ایک معاصر امیہ بن ابی الصلت کی جانب ہے، دوسری جماعت اکابر کا خیال ہے کہ اشارہ بنی اسرائیل کا ایک معلوم و معروف زاہد، بلعم باعور کنعانی کی جانب ہے۔ اس کا ذکر تورات کے صحیفہ گنتی کے باب ۲۲-۲۳-۲۴ میں تفصیل کے

ساتھ آیا ہے۔

بہر حال وہ بر صورت جب انسان اپنے ارادہ سے فسق اختیار کر لیتا ہے تو شیطان اس کے ساتھ مستقل رفاقت قائم کر لیتا ہے، گویا اس پر سوار ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَئِنَّكَ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ
وَاتَّبَعَهُ ۚ (آیت ۱۷۶)

اور ہم چاہتے تو اس کا مرتبہ ان نشانیوں کے ذریعہ اونچا کر دیتے۔ لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرنے لگا۔

”زمین کی طرف مائل ہو گیا۔“ یعنی اپنے قصد و اختیار سے دنیا کی پستیوں کی طرف جھک پڑا۔ اور یہ اس لئے ہوا کہ اُس نے عقیدہ و عمل کا معیار بجائے وحی الہی کے، اپنے نفس کو قرار دے لیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا: یعنی اگر ہماری مشیت تکوینی یہی ہوتی کہ ہم بندہ کو بہر حال وہر صورت مجبور کر کے حسن عمل کی توفیق دیتے ہی رہتے تو بندے کے ارادے میں خلل دے کر اسے بہ جبر سیدھی راہ پر ڈال دیا کرتے۔ لیکن یہ قانون ہم نے اپنا رکھا ہی نہیں ہے۔

پہلے (۵۹) پتہ:۔۔۔۔۔

سورہ انفال اگرچہ مجموعی حیثیت سے احکام کی سورہ، خصوصاً احکام جہاد و مسائل قتال کی ہے۔ اس میں ایک موقع پر ایمان والوں کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی شناخت تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمُ آيَاتُ اللَّهِ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ دِينِهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ (آیت ۲)

ایمان والے تو ہیں وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے
تو ان کے دل سہم جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو
ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں۔
پہلی چیز یہ معلوم ہوئی کہ ان کے دل عظمت الہی کے استحضار سے سہم جاتے ہیں، اور یہی
حاصل ہے فقوے کا۔

خوف خدا و خشیت الہی کی تاکید لگے صحیفہ میں بھی ہے، چنانچہ یرسیاہ بنی کے
صحیفہ کے پانچویں باب کی دوسری آیت ہے:

”خداوند کہتا ہے، کیا تم مجھ سے نہیں ڈرتے ہو؟ کیا تم میرے حضور میں نہیں

تھر تھراتے؟“

اور انجیل جو سراسر رحمت و شفقت کی سمجھی جاتی ہے، اس کے بھی صحیفہ مکاشفہ
پندرہویں باب کی چوتھی آیت میں ہے:

”اے خداوند! کون تجھ سے نہ ڈرے گا، اور کون میرے نام کی بڑائی نہ کریگا؟“

کیونکہ صرف تو ہی قوی ہے“

اور آیتیں سن کر ان کا ایمان بڑھنے لگتا ہے، قوت ایمان کی نازگی کے لحاظ سے — یہ بیان
ہوا مومنین کے صفائے قلب کا — اور وہ ہر حال میں اللہ پر توکل رکھتے ہیں، یہ
بیان ہوا ان کی علی حالت کا

آگے مزید تشریح اور ثابہ ہوئی ہے :

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ه
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ (آیت ۳-۴)

اور یہ لوگ نماز کی پابندی رکھتے ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے

اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ تو پتے (اور پتے) مومن ہیں۔

ان کے لئے پروردگار کے پاس معفرت ہی مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔

یعنی حقوق اللہ میں سے نماز اور انفاق، یعنی حقوق بدنی اور حقوق مالی، دونوں کی ادائیگی کا پورا اہتمام رکھتے ہیں، اور محققین نے لکھا ہے کہ اعمال باطنی میں توکل اور اعمال ظاہری میں نماز و زکوٰۃ کے تصریحی ذکر سے اشارہ یہی نکلتا ہے کہ باطنی اور ظاہری زندگی میں یہی اعمال سب سے زیادہ اہم اور قابل اہتمام ہیں۔

ہمارے موجودہ دور کے لوگوں کے لئے یہ بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے بہترین اعمال ظاہری و باطنی کہہ کر کیا چیزیں پیش کی تھیں، اور خود وہ اپنے کن گڑھے ہوئے اعمال کو کمال زدگی اور کمال اسلام سمجھ رہے ہیں!

لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ اور یہی نص ہے اس پر کہ جیسا کامل ان حضرات کا ایمان ہے، ویسے ہی بڑا بھی انھیں کامل ہی ملے گی۔

————— (۲۰) —————

ایک ٹہلی سی جھلک، لیکن بڑی پرمغز، معنی خیز، مشرکین جاہلی کی عبادت کی بھی دیکھتے چلے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصَدِيَةً
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (آیت ۳۵)

اور ان کی نمازیں خانہ کعبہ کے پاس کیا تھیں؟ بجز سیٹی بجانے اور تالیان بجانے کے۔ سو عذاب کا مزہ چکھو اپنے کفر کی پاداش میں۔

دوسرے اعمال جاہلی جیسے تھے، وہ تو خیر تھے ہی۔ ان کی نماز اور سب سے بڑی عبادت وہی کیا تھی، بجز خانہ کعبہ کے گرد ایک قسم کے ہود و لعب کی منہ سے سیٹیاں اور

ہاتھوں سے مالیات!

خوب غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ آج بھی جو غیر اسلامی اور جاہلی طریقہ جاری درائج ہیں، ان کا جزو اعظم یہی باجا گا جا، مالیات اور سیٹیاں، اور انھیں سے ملتی جلتی شکلیں کھیل تماشہ کی ہیں یا نہیں؟ قرطبی وغیرہ فقہائے مفسرین نے آیت کے تحت میں لکھا ہے کہ اس میں وعید ہے ان جاہل صوفیاء کے لئے جو جد و حالی لا کر اٹھلتے کودتے، مالیات بجاتے اور ناپتے ہیں، اور اس کو کمال روحانی سمجھتے ہوئے ہیں۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں شرکین کو جس عذاب کی وعید ہے وہ تو اس دنیا میں اس طریقہ سے پوری ہو گئی، خارق عادت نہیں، موافق عادت الہی، غزوات و جہاد کے ذریعہ اور مشرکین کا قلع قمع چند ہی سال کے اندر ہو کر رہا۔

————— (۶۱) —————

اسلام میں قتال اب شروع ہو گیا ہے اور ۱۳، ۱۴ سال کے پورے صبر و تحمل، اور ہر طرح کی مظلومیت پھیل لینے کے بعد اب اجازت پہلی بار مل رہی ہے قتال کی۔ بلکہ طریقہ اور مقصد بھی قتال کا بتا یا جا رہا ہے۔ اہم ترین غزوہ، غزوہ بدر ہو اسے۔ اس میں مسلمانوں کو مال غنیمت بھی وصول ہوا۔ اُس وقت اس مال کی تقسیم کے احکام بھی ذرا غور سے سن لیجئے:

وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ
وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِن
كُنْتُمْ أَمْنًا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ
يَوْمَ التَّقَىٰ الْجَمْعِينَ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آیت ۴۱)

اور جانے رہو کہ جو کچھ تمہیں بطور مال غنیمت حاصل ہوا ہے اس کا پانچواں حصہ
اشتر اور رسول کے لئے ہے، اور (رسول کے) قرابت داروں کے لئے، اور یتیموں

کے لئے، اور مسکینوں کے لئے۔ اور اگر تم انشرا اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہو جس کو ہم نے نازل کیا اپنے بندہ (محمدؐ) پر فیصلہ کے دن دونوں جاعیں مقابل نہیں اور انشرا ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

غنیمت کے لغوی معنی بہت وسیع ہیں۔ یعنی ہر اس چیز کے جو انسان اپنی کوشش سے حاصل کرے۔ لیکن ایک محدود اور اصطلاحی معنی میں اس کا اطلاق صرف اس حال پر ہوتا ہے جو کافروں سے حالت جنگ میں بہ زور و قوت حاصل ہو۔ اس کا حصہ غزویوں میں تقسیم ہوگا اور حصہ انشرا کی نذر ہوگا۔ یعنی آج کی بولی میں یہ حصہ اسلامی اسٹیٹ کا ہوگا، اور اسلامی سرکاری خزانہ میں داخل ہوگا۔ فقہ حنفی کی کتابوں (ہدایہ وغیرہ) میں حرات کے ساتھ لکھا ہے کہ تقسیم میں یہ انشرا کا نام محض خیر و برکت کے لئے آیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انشرا کی ملک و ملک تو دنیا کا ہر مال ہے۔ اس کے بعد رسولؐ کے حصہ کا جو ذکر ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ حصہ کوئی الگ نہیں۔ یعنی انشرا اور رسولؐ کے دو حصے الگ الگ نہیں بلکہ کل ایک ہی حصہ ہے۔ جو رسولؐ کے زمانہ حیات میں ان کی خدمت میں پیش ہوتا تھا۔ نائب الہی اور خلیفہ انشرا کی خدمت میں اس کا پیش ہونا، انشرا ہی کے حضور میں پیش ہونا تھا۔ سرکاری کام کا یہ پانچواں حصہ یعنی کل کا ۱/۵ حصہ خوب سمجھ لیجئے کہ اس کو مل رہا ہے جو ایک ہی وقت میں آمر حکومت بھی تھا، اور امیر عسکر بھی اور حالی رسالت بھی!

وفات شریف کے بعد یہ حصہ بھی فقہ حنفی کے مطابق ساقط ہو گیا۔ اور خو خلفائے راشدین کا طرز عمل فقہائے حنفیہ ہی کی تائید میں رہا، کہ انہوں نے رسولؐ کا حصہ اپنی طرف منتقل نہیں کیا بلکہ دوسرا حصہ اقربائے رسولؐ کا ہوا۔ (پہلا حصہ انشرا اور رسولؐ کا ملا کر تو ایک ہی تھا) یہ جاں نثاروں کا وہ گروہ تھا، جس نے کدے سے لے کر مدینہ تک ہر حال میں ہر مصیبت میں ساتھ دیا تھا۔ اور فقہائے حنفیہ نے صراحت کر دی ہے کہ یہ حصہ نصرت قدیم کی بنا پر تھا، نہ کہ عزیز داری کی بنا پر۔ ہدایہ میں صاف ہے: ان المراد من النص قرب النصرة

لا اقرب القرابة۔ بعد وفات نبویؐ، حصہ بھی ساقط ہو گیا۔ اس کے بعد اُمت کے یتیموں کی کفالت و سرپرستی کا حصہ تیسرا حصہ ہوا۔ چوتھا حصہ اُمت کے مسکینوں یا ناداروں کا ہوا۔ دابن السبیل میں مسافروں کا حصہ شاید آج دنیا کی نظروں میں بہت کھٹکے لیکن اونچے ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے، اور اونچے درجوں میں سفر کرنے والے، اور اعلیٰ موٹروں پر سفر کرنے والے، عام مسافروں کی حاجتمندی اور مصیبت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے، جنھیں پیدل یا گھوڑے، یا اونٹ کی سواری پر منزلوں گرمیوں کی چھلپاتی دھوپ میں، یا سردیوں کی کڑکھاتی ہوئی راتیں گزارنا پڑتی ہیں۔ اور جن ملکوں میں چھوٹ چھلات کا دور دورہ ہے، وہاں کے دیہات میں غریب پر دیسیوں پر کیا گزرتی رہتی ہے وہ اس کا قوائم اندازہ بھی نہیں کر سکتے

اس طرز تقسیم کو آج کی عینک سے بھی خوب غور کر کے دیکھ لیا جائے۔ سرکاری خزانہ کا $\frac{3}{4}$ ہی نہیں پورے کا پورا $\frac{5}{8}$ ، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی غریب نواز دہسڈ عوام حکومت میں رعایا کے سب سے زیادہ مصیبت زدہ طبقوں (یعنی لاوارث یتیموں) محتاج مسکینوں اور بے زاد راہ مسافروں پر دیسیوں کے لئے وقف ہے ؟ اور آیت میں جو تلخ یوم الفرقان یا فیصلہ کے دن کی ہے، وہ معرکہ بدر کی جانب ہے، جب حق و باطل کے درمیان غلی اور حسی فیصلہ سب کے مشاہدہ میں آگیا، اور کفر و اسلام کے درمیان اسی پہلی آدمی ٹکرنے دنیا کی تاریخ میں ایک کامیاب انقلابی دعوت کی بنیاد قائم کر دی۔ یہ جنگ رمضان ۶۲۳ عیسوی میں لڑی گئی اور سلمان یعنی داعیان توحید اپنی بے سرو سامانی کے ساتھ کل ۳۱۳ کی تعداد میں تھے، اور مشرکین مکہ سواری اور ہتھیار کے ساز و سامان کے ساتھ ۹۵۰ کی تعداد میں

اَنْزَلْنَا (جو کچھ ہم نے اُتارا) یعنی توت غیبی۔ اور یہ ایجاز ہر تفصیل کا جات ہے۔ علی عجلہ نا: انتہائی تشریف و تخصیص کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس

عنوان سے کرنا، قرآن کریم کی بلاغت کا ایک خاص جزو ہے۔ آیت کے آخری جزو واللہ علیٰ کلّ شیء قَدِیرٌ میں افراد امت کو تنبیہ ہے کہ ۳/۴ جو تمہیں مل رہا ہے، اسے اپنی قوت بازو کا نتیجہ نہ سمجھو، اللہ جو ہر چیز پر قادر ہے، اسے اس کے فضل خاص کا نتیجہ سمجھو۔

—: ۶۲: —

اس حرب و ضرب والی سورۃ میں دو نکتے، چلتے چلانے ایسے بیان کر دیے ہیں جو امت کے لئے دزم و بزم کی ہر کشمکش میں شعل ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ پہلے نکتہ کا مخاطب براہ راست امت سے ہے، اور دوسرے کا، خود رسول سے پہلے پہلا نکتہ ملاحظہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا
اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آیت ۴۵)

اے ایمان والو جب تم سے کسی جماعت سے ٹکھیر ہو کر رہے، تو تم ثابت قدم رہا کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ فلاح یاب رہو۔
وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (آیت ۴۶)
اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی، اور آپس میں جھگڑا مت کیا کرو ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرنے رہو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یعین موقع قتال کا ہے۔ دشمن کی فوج سامنے کھڑی ہے۔ حکم یہ نہیں ہوتا، جذب قوموں کی طرح کہ اپنی قوم کے فخر و فحشندی کے گیت گاد، بلکہ یہ کہ اللہ کا ذکر کرو کہ قلب میں قوت ثبات اس سے ہوگی اور قدم بھی اسی سے جھکے رہیں گے۔ اور کوئی نزاع ہرگز

نہ پیدا ہونے دو نہ افراد امت کے درمیان، نہ اپنے امیر لشکر یا قائد ملت سے، کہ یہ اندرونی کشمکش، ڈسپلن، نظم یا اطاعت کے حق میں زہر قاتل ہے۔

فَتَفَشَلُوا: انتشار قوت کا لازمی نتیجہ ہست ہستی ہے۔ اور دشمنوں پر جو رعب بھاری یک دلی و یک جہتی کی بنا پر قائم ہوا ہے، وہ یقیناً جاتا رہے گا۔

وَأَصْبِرُوا یعنی جو ناخوشگوار و ناموافق حالات گرد و پیش میں پیدا ہوتے ہیں ان پر بہر حال صبر سے کام لیتے رہو۔ صبر محمود تو ہر حال میں ہے، موقع قتال پر او زیادہ۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ: جزم اور قطعیت کے ساتھ فرمادیا گیا ہے کہ معیت حق خود خدا میں نصرت ہے۔

دوسرا اصولی نکتہ اس سے بھی زیادہ اہم و ضروری اور زندگی کے انفرادی و اجتماعی دونوں شعبوں میں کام آنے والا، محض ضمناً، انگریزی محاورہ کے مطابق

By The Way یا، راہ چلتے، یہ ارشاد ہو گیا ہے:

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ

حَتَّىٰ يُغَيِّرَ مَا بِأَنفُسِهِمْ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (آیت ۵۳)

یہ سب اس سبب سے کہ اللہ کسی نعمت کو جس کا انعام وہ کسی قوم پر کر چکا ہے، نہیں بدلتا، جب تک وہ لوگ اس کو بدل نہ دیں جو ان کے پاس ہے

اور بیشک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

یعنی کوئی نعمت جو کسی قوم کو ملی چکی ہوتی ہے، وہ اس سے چھین نہیں لی جاتی جب تک

وہ قوم اپنی حالت اس سے مختلف نہ کرے، جو نزولِ نعمت کے وقت تھی۔ اپنے اندر بجائے

ایمان و اطاعت کے کفر و نافرمانی اور بغاوت نہ پیدا کر لے۔ نعمت اور خُبث کا اجتماع

خلافتِ حکمت الہی ہے۔ اس لئے پہلے خُبث پیدا ہوئے گا، جب جا کر سلبِ نعمت ہوگا۔

اور نعمت کا مفہوم عام ہے۔ دنیوی، اخروی، انفرادی و ملی، مادی و روحانی سب ہی قسم کی

عظیم ہے، یہ اس کلام سے ظاہر ہے۔
 وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ وہ اپنی قدرت و قوت سے جو چاہے، اور اپنی حکمت سے
 مناسب طریق پر چاہے کر دکھائے۔

— (۶۴) —

اب آپ سورہ برآۃ یا سورہ التوبہ پر آگئے، اور یہیں وہ آیت ملتی ہے جو منجملہ
 قرآن مجید کی ان چند آیتوں کے ہے جو مستشرقین کے طعن کی ہفت ایک مدت دراز
 سے بنی چلی آرہی ہیں۔ قرآن کے کلام الہی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اسے
 جو کچھ کہنا ہوتا ہے اسے (بہ قول حضرت تھانوی) بے دھڑک کہہ دالیتا ہے بلا لحاظ
 اس کے کہ سننے والے کیا رائے قائم کریں گے۔ وہ لاکھ کپڑے ڈالیں، مسخر کریں، ہر حال
 واقعہ، واقعہ ہی رہے گا، اور حقیقت آخر کار حقیقت ہی ثابت ہو کر رہے گی۔
 قرآن مجید نے عقیدہ ابن التلبیت کا الزام جس طرح سیحیوں پر لگایا ہے، اسی
 طرح یہودیوں پر بھی۔ اور مستشرقین کی طرح یہود اس سے بھڑک رہے ہیں اور
 کان پکڑ کر کہہ رہے ہیں کہ حاشا یہ ہم پر اتہام ہے۔ ہم سدا کے موحّد ہیں، اور ہم خدا
 کی بیوی بیٹا کیا جانیں۔

بات ذرا دیر میں صاف ہوگی اور مجرم کے ثبوت اور بچہ صفائی کی پیشی میں کچھ
 وقت لگے ہی گا۔ سامعین ذرا صبر و تحمل کے ساتھ سنیں۔
 قرآن مجید کے الفاظ ہیں:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصْرَى الْمَسِيحُ
 ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ يَفْتَرَاهِهِمْ يُضَاهُونَ
 قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ قَاتِلْهُمْ اللَّهُ أَعْلَىٰ

يُؤْفِكُونَ ۝ (آیت ۳)

یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے فرزند (مجازی) ہیں، اور نصرانی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے فرزند (مجازی) ہیں۔ یہ ان کا قول ہے محض منہ سے نکل دینے کا۔ یہ انہیں لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے قبل کافر ہو چکے ہیں اور اللہ انہیں ہلاک کرے کہ پھر بہکے جا رہے ہیں۔

سب سے پہلے عزیر، عبرانی تلفظ میں عزرا کی شخصیت سے تعارف حاصل کر لیجئے۔ اسرائیل کے مذہبی نوشتوں میں ان کی شہرت کاتب تورات کی حیثیت سے ہے۔ سال وفات غالباً ۴۵۸ ق۔ م۔ بخت نصر ستونی ۵۶۱ ق۔ م، تاجدار ایران و عراق نے جب یہود پر حملہ کر کے انہیں کامل طور پر تباہ و برباد کر دیا، تو ایسی سخت مصیبت کے عالم میں خود تورات کے نسخے بھی ان کے پاس سے یکسر گم ہو گئے۔ تقریباً ایک صدی ایسی طرح گزر گئی۔ بالآخر انہیں عزیر ربی نے تورات کو اپنی یادداشت سے دوبارہ لکھ دیا۔ اور امت یہود اس احسان عظیم کے بعد انہیں شیل مولیٰ ماننے لگی۔ اور بعض نے غلو کر کے انہیں اس مرتبہ بھی بڑھا دیا۔

اب دوسری بات یہ غور سے سننے کی ہے کہ قرآن میں لفظ ابن اللہ آیا ہے ولد اللہ نہیں۔ اور عربی میں ابن اور ولد الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں جیسے اردو میں لڑکا اور بیٹا، یا انگریزی میں اور بائبل کے خاص محاورہ میں ایک Child of God دوسرا Son of God۔ ابن اللہ Child of God سے مراد صلیبی یا حقیقی فرزند نہیں ہوتا، بلکہ خدا کا فرزند معنوی، مجازی، یا لاڈلا یا چیتا ہوتا ہے۔ قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ اہل کتاب ہی کی زبان سے فقرہ نقل ہوا ہے: يَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاءُهُ۔ یہاں انہار کا عطف احبباء پر ہے، اور کھلے ہوئے معنی فرزند مجازی یا لاڈلے چیتے کے ہیں۔ یہود اس معنی میں حضرت عزیر کو مطاع کل اور محبوب خدا مانتے

اور ابن اللہ یا Child of God سے موسوم کرتے۔
 مسیحیت کی دو بنیادی گمراہیاں الگ الگ ہیں۔ ایک شدید، دوسری آشد
 یا شدید تر۔ ایک حضرت مسیح کو اللہ کا ولد یا بیٹا Son of God ماننا، اس
 عقیدہ کا ذکر جہاں قرآن میں آیا ہے، بہت ہی سخت لہجہ کے ساتھ آیا ہے۔
 تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ (قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے) وغیرہ۔
 دوسری گمراہی ہے مسیح کو ابن اللہ Child of God قرار دینا۔ یہ گمراہی
 بھی اگرچہ سخت اور ہلک ہے، پھر بھی ولد اللہیت کا عقیدہ اس ابن اللہیت سے کہیں
 آشد ہے۔ یہود اس شرک جلی تک بے شک نہیں پہنچے۔ لیکن قرآن انہیں اس کا
 مجرم ہی کب قرار دیتا ہے۔ البتہ ابن اللہیت میں کسی حد تک وہ مسیحیوں کے ہم سطح ہو گئے
 اس فرق و قیاس کے نکتہ تک ہمارے بعض مفسرین پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ بحر المحیط میں یہ قول
 نقل ہوا ہے، اور ابن عطیہ کے حوالہ سے تفسیر قرطبی میں بھی، کہ اس ابنیت سے مراد نسلی و
 نسبی فرزند ہی نہیں، بلکہ محض لاڈ اور پیار والی فرزند ہی مراد ہے، اور خود یہ عقیدہ بھی کفر ہی
 ہے۔ یہ ابنیت والی گمراہی، یہود اور نصراہیوں، دونوں میں مشترک ہے۔ اور نہ صرف
 انہیں دونوں میں، بلکہ یونان، مصر وغیرہ کی بہت سی قدیم و جاہلی قوموں میں۔
 ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ: محض ایک بکواس ہے۔ جو ان لوگوں نے
 بک ڈالی ہے، جسے حقیقت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور یہ فقرہ کلام کو موکد اور
 زوردار بنانے کے لئے لایا گیا ہے۔

يُضَاهِيُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ: یعنی اس اہل عقیدہ پران کے
 پاس تو کوئی دلیل ہے نہیں، نہ عقلی نہ دینی، یہ تو محض تقلید ہے، ان کافر قوموں کی جو ان
 پیشتر ہو چکی ہیں، اور خدا کی تجسیم کی قائل ہو کر عقیدہ حلول کی ماننے والی ہوئی ہیں۔
 اشارہ خصوصی مشرکین یونان کی جانب ہے کہ انہیں کے فیلسوفوں کی خام خیالیوں کے

یعنی اہل کتاب نے اپنے علماء و مشائخ کو ایسا مستقلاً صاحب اختیار مان رکھا ہے کہ گویا وہ جو چاہیں جائز ٹھہرائیں اور جس چیز کو چاہیں حرام قرار دے دیں۔ سارے اختیارات شریعت و قانون سازی کے گویا انھیں کو حاصل۔ مسیحیوں کے ہاں آج بھی پوپ (پاپا کے روم) بحیثیت نائب مسیح یہ سارے اختیارات علانیہ رکھتا ہے اور پروٹسٹنٹ بھی علماً سارے اختیارات چرچ (کلیسا) کو سپرد کئے ہوئے تھے اور تالمود کی اب بھی جو اہمیت ہے، محتاج بیان نہیں۔

آیت کی تفسیر ماثور بھی یہی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ نو مسلم عدی بن حاتم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اپنے مقتداؤں اور پیشواؤں کو خدا کب مانتے ہیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حلال و حرام کے اختیارات ان میں مان لینا، انھیں خدائی ہی اختیارات دے دینا اور انھیں معبودیت کے مرتبہ پر پہنچا دینا ہے۔

آیت میں عوام مسلمانوں کے لئے بڑی عبرت موجود ہے۔ انھوں نے بھی مختلف اماموں اور مشائخ کو مستقل مطاع قرار دے کر علماً انھیں مصومیت بلکہ خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ قرآن کی روشن آیات کو اپنے ضمیر کی واضح شہادت کو، کھلے ہوئے مشاہدہ کو، سب چھوڑ دیں گے، لیکن اپنے شیخ کو کسی حالت میں نہ چھوڑیں گے۔ امام رازی نے یہاں پہنچ کر اپنے استاد کا قول نقل کیا ہے کہ میری نظر سے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ جن کے سامنے میں نے ان کے مسلک کے خلاف قرآن کی آیتیں سنائیں، انھوں نے نہ تسلیم نہ کیا، نہ انھیں قابل التفات خیال کیا، بلکہ اُلٹے حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے کہ ان کے اسلاف کے خلاف یہ آیات قرآنی کیوں کر ہو سکتی ہیں اور تاویل بجائے ان کے اقوال میں کرنے کے خود آیات قرآنی میں کرنا چاہتے۔ امام صاحب اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ غور سے دیکھئے تو اکثر اہل دنیا اسی بیماری میں مبتلا نظر آئیں گے۔

مسیحیت کی گمراہیوں میں علاوہ انہی الٰہی و الوہیت الٰہی کے ایک بڑی گمراہی

یہ بھی کہ سچ کو منطاع مطلق سمجھتے۔ اور منطاع مطلق بھی بالکل اور براہ راست حق تعالیٰ کے مساوی اور ہم مرتبہ اور ان کی مطاعیرت چونکہ یورپ اور کلیسا کی مطاعیرت کے الگ اصلاً و مستقلاً تھی، اس لئے قرآن مجید نے اس کا ذکر بھی الگ کر کے کیا۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ وَاحِدًا: اور یہ توحید خالص کا حکم، شرک جلی و خفی کی ہر صورت سے الگ رہنے کا حکم آج تک توریت و انجیل میں بے شمار تصرفات و تحریفات کے باوجود لکھا چلا آ رہا ہے۔ مثلاً توریت میں کہ ”میرے حضور تیرا دوسرا خدا نہ ہوئے۔“ دیکھیے صحیفہ خروج، باب ۲۔ آیت ۲۔ نیز صحیفہ استثناء باب ۵، آیت ۶ اور انجیل مرقس کے باب ۱۲۔ آیت ۲۹ میں ہے:

”سب حکموں میں اول کون سا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ، اول یہ ہے،

اے اسرائیل، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔“

سُبْحَنَكَ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ اللہ کی ذات پاک و برتر ہے، نہ صرف جاہلی مشرکوں کے کھلے ہوئے اور اقبالی شرک سے، بلکہ اہل کتاب کے باریک و خفی مختلف قسم کے شرکوں سے بھی۔

—: (۶۶): —

سورۃ التوبہ کہنا چاہیے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ جلالی سورہ ہے۔ احکام جن وقتال اور مشرکوں اور اہل کتاب، سب کے لئے وعیدوں سے لبریز۔ لیکن خاتمہ اس کا شان جہالی پر ہوتا ہے۔ اور جس نے خود اپنا نام رؤف و رحیم رکھا ہے، اُس نے اپنے رسول صاحب جمال کو بھی یہاں اسی روپ میں پیش کیا ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ (توبہ، آیت ۱۲۹)

بیشک تمہارے پاس ایک سمیر آئے ہیں، تمہاری جنس میں سے۔ انہیں بہت گراں گزرتی ہے، جو چیز تمہیں مضرت پہنچاتی ہے۔ تمہاری بھلائی کے حریص ہیں۔ ایمان والوں کے حق میں بڑے شفیق ہیں، مہربان ہیں۔

پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں ”تم“ سے کون مراد ہے۔ اور ضمیر جمع مخاطب ”گم“ دونوں جگہ کس کے لئے ہے؟ بعض نے لکھا ہے کہ مراد اہل عرب ہیں کہ آپ انہیں کے درمیان بھیجے گئے تھے۔ لیکن قول محقق یہ ہے کہ خطاب ساری نوع انسان سے ہے۔ اور آپ کی بعثت تنہا عرب کی جانب نہیں، سارے عالم کی جانب تھی۔ کبیر اور روح المعانی دونوں میں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ الخطاب للبشر علی الاطلاق۔ اور قرطبی نے یہ قول ایک مشہور امام لغت زجاج کی جانب منسوب کیا ہے۔ مشرک قوموں اور شرک مزاج گرد ہوں کی سمجھ ہی میں یہ نہیں آتا تھا کہ منصب رسالت پر کوئی بشر کیسے مامور ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر بار بار زور دینا اسی گمراہی کے رد میں ہے۔

عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ : آپ کے مزاج کی خصوصیت یہ تھی کہ جو چیزیں بشریت و مرتبہ انسانیت کو نقصان پہنچانے والی ہیں، وہ آپ کو سخت گراں گزرتی تھیں، اور آپ کے دل پر ان کا بار رہتا تھا۔ اور آپ کو انسانی ظلم و بیہود کا جیسے، ہو کارہتا تھا۔ تو جب آپ کی شفقت ساری خلق اللہ کے لئے تھی، اور آپ کے دل میں درود نوع انسانی کے لئے تھا۔ تو خاص مومنین کے ساتھ آپ کے درجہ رافت و کرم، درجہ شفقت و تعلق قلب کو کون پاسکتا ہے؟

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ : اسی درجہ تخصیص کے اظہار کے لئے ہے۔ رافت و رحمت تو خدا کی صفات والقباب ہیں۔ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ کا لقب آپ کے سوا اور مل کس کو سکتا تھا۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ

تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (آیت ۱۳)

اب بھی یہ لوگ اگر روگردانی کئے رہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے تو
اشتر کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور
درہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

جب عرش الہی موجودات عالم میں سب سے عظیم تر ہے، تو جو اس کا مالک پروردگار
ہے اس کی ماتحتی اور ملک کامل میں سارے موجودات عالم کا ہونا بالکل ظاہر ہے۔ تو
یہ لوگ اگر یہ سب کچھ جاننے بوجھنے کے بعد بھی انکار حق پر قائم رہیں، تو آپ کہہ دیجئے
کہ میرا حفظ و ناصر تو مالک حقیقی ہے۔ مجھے تمہارے انکار و اعراض سے ضرر کیا، میرا تکیہ
اسی ذات عظیم پر ہے، نہ کہ اپنے نفس پر یا کسی اور کی ذات پر۔

اور اسی پر اس سلسلہ معروضات کا اختتام ہے۔

خیال یہی تھا، اور یہی دلی تمنا تھی کہ کلام پاک کے جتنے مقامات بیسویں صدی عیسوی
کے ایک طالب علم کی نگاہ میں قابل بحث نظر آئیں، اور جہاں جہاں اس کی نگاہ ٹھٹھکے
اور قلب کچھ بھٹکے، سب ایک لڑی میں پرو کرنا ظہرین باتمکین اور سامعین صدر نشین کی
خدمت میں پیش کر دیے جائیں اور اس کی برکت سے اشکالات کے حل مل جائیں اور
شک و شبہ کی راہ کے کانٹے نکل جائیں۔ دلی رنج و قلق اور بڑی ہی گہری شرمندگی
و حسرت کے ساتھ عرض ہے کہ مطالعہ پورے قرآن مجید کا کیا معنی، آدمی کا بھی
نہ ہو سکا۔ اور ایجاز و اختصار کی کوشش کے باوجود احاطہ صرف ایک تہائی یا ثلث
قرآن کا ہو سکا۔

معذرت خواہی آپ ہی کے لطف و کرم سے ہے، اور عجب نہیں کہ ایک
بندہ حقیر و نادان کی یہ محض طالب علمانہ کوشش آئندہ کے کسی فاضل و مجید مفسر

کے لئے ٹٹھاتی ہوئی روشنی کا کام دے جائے۔ اور وہ اسی کی بنیاد پر ایک پورا منارہ نور
تاکم کر جائے۔

برادرانِ ملت! اب رخصتی کا سلام قبول فرمائیں۔ اور حشر میں جب ملاقات ہو
تو ادھر سے معروضات کی تشنگی کا اعتراف ہو، اور ادھر سے آپ کی قدر افزائی کے
الفاظ بہت اور جوصلہ پیدا کر رہے ہوں، اور رحمتِ الہی اپنی بارش سے ہم کو، آپ کو
سب کو ڈھانپ لے!

✓ ۶/۱/۹۵

5/2/95

ختم شد

مشکلات القرآن

مطالعہ

پیشویہ

مولانا عبدالحق صاحب دہلی

مجلد